مولوی نذیر احمد کی کہانی
کچھ انکی کچھ میری زبانی

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

مع مقدمہ، سوانح، خواہشی، فوٹو و عکسی خطوط

وغیرہ وغیرہ

پبلشرز	جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ با اجازت جنابہ بیگم صاحبہ مرزا فرحت اللہ بیگ	۱۹۵۲ء ایڈیشن

ایجوکیشنل بک ہاؤس تاجران کتب

سول لائن حامد بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ (یوپی انڈیا)

مولوی نذیر احمد کی کہانی

کچھ ان کی کچھ میری زبانی

از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی

اڈیشن ۱۹۵۲ء	پبلشرز	قیمت عہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس تاجران کتب

سول لائن۔ حامد بلڈنگ (یونیورسٹی ایریا) علی گڑھ (یوپی انڈیا)

(جید برقی پریس بلیماران دہلی)

مقدمہ

از بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فرد بے نظیر گذرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اردو زبان زندہ ہے ان کا نام بلاشبہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت۔ استقلال اور قابلیت سے دنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ادنیٰ طالب علم سے اعلیٰ درجہ کے فاضل ہو گئے ان کی زندگی سلف ہلپ (SELF HELP) اپنی مدد سے آپ بڑھنے کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہے۔ انہوں نے معلمی سے زندگی شروع کی اور آخر عمر تک معلم رہے۔ انکی تعلیم ان کی تصانیف کے صفحات میں موجود ہے۔ ان کا بڑا کام اصلاح معاشرت SOCIAL REFORM (سوشل ریفارم) ہے یعنی یہ کہ دنیا میں خوش۔ کامیاب اور بے لوث زندگی کیونکر بسر کرنی چاہئے لیک بڑا کمال ان کی تصانیف میں یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے۔ اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر

شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی خاندان کے پتر ے تو نہیں کھل رہے ہیں خدا کے فضل سے اُردو میں اس زمانے میں ایسے ایسے باکمال انشار پرداز ہوئے اور اب بھی زندہ موجود ہیں جو اُردو زبان اور اپنی قوم کے لئے باعث فخر ہیں. مثلاً کسی نے تاریخی واقعات کی چھان بین کرکے عجیب حالات کا انکشاف کیا ہے۔ کسی نے دربار شاہی کی شان شوکت یا جنگ کے خوں ریز منظر کا مرقع کھینچا ہی کسی نے قوم کے گزشتہ جاہ و جلال پر فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کسی نے قومی ادبار و مذلت پر پُر درد نوحہ پڑھا ہے۔ لیکن روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں. ان کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہے۔ اور بیان بھی کیسا! ایسا پُر لطف، ایسا سچا، اور سُلجھا ہوا کہ دل میں کھپ جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آجائیں. ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں۔ صحرا بھی ہو۔ دریا بھی ہو۔ آسان ہے. لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہی یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشیاء تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اسے عکس ریز (X RAYS) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجۂ کمال موجود تھی.

مولانا کا احسان تعلیم نسواں پر بھی کچھ کم نہیں. بلکہ میرے

خیال میں حامیانِ تعلیم نسواں کی تقریروں۔ لکچروں۔ تحریروں اور قیام مدارس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان لوگوں نے پڑھنے کی ترغیب دی اور اس کے وسائل بہم پہنچائے۔ مگر مولانا نے لڑکیوں کو پڑھنا سکھایا۔ اور یہی نہیں بلکہ پڑھنے میں جو مزہ ہے وہ دلوں میں پیدا کیا۔ مرحوم اگر مراۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے باکمال انشا پرداز مانے جاتے۔ اور ان کی حیاتِ جاودانی کے لئے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ ایک بڑی خوبی اس میں (اور ان کی دوسری کتابوں میں) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور ان کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ خود عورتیں قائل ہو ہو جاتی ہیں یہ بات مرحوم کے سوا اردو کے کسی دوسرے مصنّف کو حاصل نہیں۔ مولانا اپنی طرزِ تحریر کے آپ موجد تھے۔ اور یہ ان ہی کی ذات سے مخصوص ہے۔ اس میں بڑی بے تکلفی اور بےساختہ پن پایا جاتا ہے۔ انشا پرداز کو بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ جو خیال اس کے دل میں آیا ہے اسے اسی قوت اور شان کے ساتھ الفاظ میں ادا کرے۔ اور اسی لئے اسے اکثر اوقات تشبیہہ و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو کبھی ایسی دقّت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کبھی تشبیہات و استعارات سے کام نہیں لیتے۔ اور ایسے ٹھیٹ جاندار اور چسپاں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان سے بہتر اس خیال کے اظہار کیلئے سمجھ میں نہیں آتے۔ زبان پر انھیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ شاید

آج تک کسی اُردو انشا پرداز کو نہیں نصیب ہوئی اور یہی
وجہ ہے کہ ان کا خیال کبھی تشنہ نہیں رہتا۔ آمد کی یہ کیفیت ہے
کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ ان کی طبیعت قدرتی طور
پر پُرزور واقع ہوئی تھی۔ اور یہی زور ان کے تمام خیالات اور
الفاظ میں ہے۔ جو قوت اور زور میں نے ان کی عبارت
میں دیکھا ہے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ انہیں اس بات
کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا تشبیہات و استعارات
سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں۔ وہ اسی زبان میں سے جیسے ہم روزمرہ
بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ گویا
وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لئے بنے ہیں اور پھر اس پر ظرافت
سونے میں سہاگے کا کام دیتی ہے۔ ان پر یہ اعتراض کیا گیا ہے
اور وہ ایک حد تک بجا اور صحیح بھی ہے کہ وہ بعض اوقات رکیک
اور مبتذل الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو وہی
ہے جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ یعنی وہ ہیر پھیر اور تشبیہات و
استعارات سے کام لینا نہیں جانتے تھے۔ دوسرے طبیعت
قدرۃً واقع ہوئی تھی۔ پُرزور۔ وہ اپنا خیال اسی زور اور شان کے
ساتھ ادا کرنے کے لئے الفاظ کی پروا نہیں کرتے تھے جن الفاظ
میں ان کا اصلی خیال صحیح طور پر ادا ہو سکتا تھا۔ ان کے استعمال
میں کبھی نہ چوکتے تھے۔ اور یہ فعل ان کا کوئی ارادی نہ تھا۔ بلکہ
طبیعت کی اُفتاد ہی ایسی تھی۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
ان کی طبیعت میں آورد نہ تھی۔ بلکہ سراسر آمد تھی۔ علاوہ اس کے

آدمی تھے صاف گو اور آزادہ رو۔ جو دل میں تھا وہ زبان پر اور اس پر شوخی وظرافت اور غضب تھی یہی وجہ ہیں کہ ان کی ایک کتاب پر اس قدر شور وغل مچا

مرحوم جیسے اعلیٰ درجہ کے محرّر تھے ویسے ہی مقرّر بھی تھے۔ لوگ ان کے لکچروں میں اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے جیسے قحط کے مارے کھانے پر گرتے ہیں۔ ہم نے خود انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں دیکھا ہے کہ گرمی کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہے ہزاروں بندگانِ خدا دھوپ میں بیٹھے ہیں مگر کیا مجال کہ پہلو تک بدلیں۔ کلام میں تاثیر بھی وہ تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا۔ جب چاہا رلا دیا آواز بھی ایسی ملی تھی کہ سب جگہ یکساں پہنچتی تھی اور اس میں ایک خداداد اثر تھا شوخی وظرافت خاص کر ان کے لکچروں میں دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی۔ ایسا اعلیٰ درجہ کا مقرر ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا۔ وہ ساری مجلس پر چھا جاتے تھے۔ اور حاضرین مجلس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مسٹر مارلیسن کی جو رائے مؤلف نے لکھی ہے وہ بالکل صحیح اور بے مبالغہ ہے۔ انجمن حمایت الاسلام آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ مدرسہ طبیہ دہلی ہمیشہ ان کے لکچروں کے شرمندۂ احسان رہیں گے۔ ان کے لکچروں کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں کے کہیں چلے جاتے تھے۔ یہ اعتراض شاید کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسی ان کی طبیعت ان کی تحریر انکی عبارت اور ان کے الفاظ اور ان کی تقریر پُرزور تھی ویسے ہی ان کا خیال بھی پُرزور تھا اور تخیل کے پرواز میں دور تک پہونچ جاتے تھے لیکن اتنی دور نہیں کہ نظر سے غائب ہو جائیں جولانی طبع انھیں ادھر سے اُدھر ضرور لے جاتی تھی۔ تاہم مبحث کے آس پاس ہی رہتے تھے ہمارے اس زمانے کے اہل قلم سوائے ایک دو کے زیادہ تر ترجمان ہیں

انگریزی کے یا عربی کے مگر مرحوم میں جدت پائی جاتی ہے اور وہ اپنے خیالات اور تحریرات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور یہ ان کی اعلیٰ دماغی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ان کی اصل تصانیف ان کی جدت طرازی۔ ان کے پُرزور تخیل اور مشاہدے کے نتائج ہیں وہ نقل نہیں ہیں بلکہ اصل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ انوکھی اور دلآویز ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول خاص و عام ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

کون ہے؟ "نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" کو پڑھکر مرزا فرحت اللہ بیگ کی ظرافت، ذہانت، ان کے طرز ادا، ان کی بے تکلفی، اور آزادہ روی، محبت و خلوص سے متاثر ہو کر ان کی داد نہ دے گا۔ مولانا نذیر احمد کے حالات پر بہت سے مضامین لکھے گئے مگر کہیں ان کی زندگی، اور سیرت، اخلاق و عادات، ان کے اوقات و مشاغل اور پرائیویٹ لائف (PRIVATE LIFE) کا نقشہ نظر نہیں آتا جو اس کہانی میں ہے۔ اس سچی بیوگرافی BIOGRAPHY سے گراں بہا فائدے آئندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں۔ مولانا نذیر احمد ایک سچّے اور کامیاب طالب علم کی بے نظیر مثال ہیں۔ حالتِ ناداری و بے پدری میں ان کی علمی ترقی اور ترقی بھی ایسی کہ اُس نے مولانا کو کنجاہ کے منڈوں کی مدرسی سے ڈپٹی کلکٹری اور اعلیٰ حضرت نظام مرحوم کی معلمی کے درجہ تک پہنچا دیا۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جو ہر وقت طالب علم کے پیشِ نظر رہنی چاہیئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ستمبر ۱۸۸۳ء دلکشا منزل محلہ چوڑی والان دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی ہی میں تعلیم پائی اور یہیں چھوٹے سے بڑے ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلامی طریقے پر ہوئی۔ فوقانیہ جماعتوں میں ہمیشہ اوّل و دوم رہے۔ جب انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو نقرئی تمغہ حاصل کیا۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کا امتحان اچھے نشانات سے پاس کیا اور وہیں ایم اے میں پڑھا۔ کالج کی چار دیواری سے باہر بھی کھیل کے میدان میں مرزا کی مقبولیت کا وہی عالم تھا جو کالج کے اندر تھا۔ کالج کی ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

۱۹۰۷ء میں حیدرآباد مدرس کی حیثیت سے گئے اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پر سیشن ججی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ یہیں شادی کی۔ یہیں پنشن ہوئی اور یہیں ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا۔ اور یہیں الٰہی چمن کی خاموش فضا میں آرام سے سو رہے ہیں۔ گھر میں فرحت اللہ بیگ سیدھے سادے دیسی طریقے سے رہتے تھے۔ آرام کرسی یا صوفے وغیرہ پر ان کو آرام نہیں ملتا تھا ہمیشہ کہا کرتے کہ جو مزہ لوٹ مارنے میں ہے وہ ان کرسیوں یا صوفوں پر بیٹھنے میں نہیں ہے۔ دفتر میں تو وہ میز کرسی پر بیٹھ کر لکھا کرتے تھے مگر گھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کے لئے میز کرسی سے

کام نہیں لیا۔ لکھنا ہوا تو اُکڑوں بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کر دیا۔ سارے مضامین وغیرہ انہوں نے زیادہ تر اسی ترکیب سے بیٹھ کر لکھے ہیں۔ میز کرسی پر کھانے میں ان کو مزا نہ آتا تھا جب نیچے دستر خوان پر کھانا کھاتے تو اُکڑوں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ایک مزاح نگار ادیب سمجھے جاتے تھے لیکن جو ادبی سرمایہ انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نرے مزاح نگار نہیں تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بعض دوسری حیثیتوں کے بھی مالک تھے۔ اُردو زبان و ادب کا مورخ انہیں مختلف عنوانوں سے یاد رکھے گا یہ سب جانتے ہیں کہ انہوں نے سیرت نگاری یا شخصیت نگاری کے بہت اچھے نمونے پیچھے چھوڑے ہیں۔ دلّی کی مقامی بول چال اور دلّی والوں کے مخصوص محاورہ، روزمرہ، عورتوں کی زندگی، اور گھریلو معاملات کے بارہ میں، وہ دلّی کی زبان کو ہر قسم کے مضامین میں برتتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں اور دلّی کی زبان کے سب سے اچھے لکھنے والے قرار پاتے ہیں۔

اسی تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ مرزا نے شعر و سخن کی تالیف، تدوین اور تنقید کا بھی کام کیا ہے مثلاً نظیر اکبر آبادی، سید انشا اور حکیم آغا جان عیش دہلوی، اُن کے مقالے انکے ذوق تحقیق اور تنقیدی صلاحیت کا پتہ دیتے ہیں اور ان تنقیدی مضامین میں ہلکے سے مزاحیہ کی آمیزش بڑا لطف دیتی ہے تنقید اور ظرافت کا یہ آمیزہ ہمارے ادب میں بڑی کمیاب چیز ہے۔

الغرض یہ کہ مرزا فرحت کے متنوع ادبی مشاغل تھے تاہم اس میں شک نہیں کہ ان کا اصلی ادبی کام مزاحیہ مضمون نگاری تھا اور وہ بڑے پایہ کے ظرافت نگار تھے۔ مزاحیہ ادب کا

نقاد اسی سلسلہ میں بتائیگا کہ مرزا فرحت کی ظرافت زبان اور انداز بیان کی ظرافت ہے، واقعات کی ظرافت نہیں وہ زبان کی چاشنی، اسلوب کی دلآویزی، فقروں کی لطافت اور الفاظ کی مخصوص ترتیب سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور مضحک واقعات کا سہارا نہیں لیتے مرزا فرحت کے مضامین پڑھتے وقت سب سے پہلی چیز جو ہم محسوس کرتے ہیں یہ ہے کہ ان کی ظرافت' وہ جہاں بھی ہے اور جتنی بھی ہے بالکل غیر شعوری چیز ہے، کوشش تصنع اور آورد کو اس میں مطلق دخل نہیں، بے ساختگی اس کی نمایاں ترین خصوصیت ہے یہی اصل میں کامیاب ترین اور سب سے مکمل ظرافت ہے

الغرض تنقید کی اصطلاحوں اور تنقیدی اصول کی حد بندیوں سے کام نہ لیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرزا فرحت کی تحریریں طنز یا ظرافت یا خوش طبعی یا جو کچھ بھی ہے وہ ایک قدرتی اور بے ساختہ انداز میں ہمیں ملتا ہے۔ اور ہماری داخلی و خارجی زندگی کی پختگی و بالیدگی کی ایک خاص منزل کا نشان ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے انتقال کو ابھی پانچ ہی برس ہوئے ہیں اس لئے بعض مبصر یہ کہیں کہ ان کے آرٹ (ART) کا اندازہ آئندہ نسلیں بہتر کر سکیں گی لیکن جو عالم گیر مقبولیت مرزا کو خود اپنی زندگی میں حاصل ہوگئی ہے وہ اسی بات کی ضامن نظر آتی ہے کہ مستقبل میں بھی ان کا نام درخشاں رہے گا۔

"مولوی نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی"

مرزا فرحت بیگ کے آرٹ (ART) کا ایک بے مثل شاہکار ہے اسی مضمون میں مرزا نے عقیدت اور طنز (SATIRE) کو سمو کر اردو ادب میں کردار نویسی کے ایک نئے ڈھنگ کی بنیاد ڈالی ہے، یہ کہانی ایسی ہے کہ اس کی مثل نہ انگریزی میں کوئی ایسی مختصر اور چلتی پھرتی زندہ تصویر

موجود ہے اور نہ کسی اور زبان میں۔

کہانی میں مولوی صاحب کی گھریلو زندگی، عادات، اطوار، طبیعت اور فطرت کا جو نقشہ کھینچا ہے ان کی شوخیٔ تحریر کہے دیتی ہے کہ لکھنے والے نے مولوی صاحب کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس دور کی تہذیب اور شائستگی کے چلتے پھرتے اور بولتے چالتے نمونے سامنے رکھ دیئے ہیں اور اپنے اُستاد کی شخصیت کو اُردو ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے مرزا صاحب کے قلم نے جو جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے وہ اُردو ادب میں بے مثل رہے گی۔ اور مرزا صاحب کے یہ کارنامے اُردو ادب میں زندہ رہنے والے ہیں۔ اور ان کے ساتھ خود مرزا صاحب کا نام بھی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا سلیم پانی پتی نے جو اس کہانی کو پڑھا تڑپ گئے اپنے شاگردوں کو بُری طرح کوسا "تم میں سے ایک بھی نہیں جو ہماری زندگی کو اس رنگ میں لکھ سکے تُف ہے تم پر" حسنِ اتفاق سے ایک مشاعرے کے سلسلے میں مولانا سلیم اور مرزا کی ملاقات بلکہ آمنا سامنا اورنگ آباد اسٹیشن پر ہو گیا۔ تعارف کے بغیر ہی مولانا مرزا سے لپٹ گئے اور مولانا تابڑ توڑ بوسے پہ بوسے لینے لگے۔ اور کہنے لگے میاں فرحت مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمہارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں مگر موقع نہ ملا قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا بھئی مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا۔ مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اس رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا۔

مرزا صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجئے، مر جائیے مضمون میں لکھ دوں گا۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کی تعمیل بھی کر دی۔

عکس خط شمس العلماء مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

مخدومی

غلام محمد خان جو بالفعل علوی صاحب کے
متوسل رہ چکے ہیں بھتیجے اور داماد ہیں مجھ سے جہانگیر
خان صاحب سے گفتگو رہی اور جب ڈیڑھ نو برس
[illegible] اور یہ [illegible] گیا تھا مجھ کو [illegible] اور [illegible]
اور حسن تدبیر [illegible] سے [illegible] کا [illegible]
مشغلہ محمد جہانگیر خاں صاحب کی بدولت مجھ کو [illegible] جان
وجیہ آدمی ہیں جوان انگریزی خوب جانتے
اور [illegible] بولتے ہیں سمجھتے ہیں

غرض کہ صدر ریاست نہایت مناسب ہیں اگر
مجھکو ملیں تو بہت خوش ہوں گا
اور آپکے مشورہ سے ہوں تو محمد جہانگیر
جاہ کی نظروں میں مجھکو سرخرو رکھی
گی —

۹ جمادی الاول ۹۶ نذیر احمد

عکس خط شمس العلماء، ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب

(بہ حالت رعشۂ ہاتھ)

بخدمت شریف سید افتخار عالم صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ - آپ ایک

مدت سے میرے حالات زندگی لکھنے کے بارے

میں مجھ سے مراسلہ کر رہے ہیں اور میں نے کبھی

شرکت یا امداد کی حامی نہیں بھری - اس سلسلہ میں

سنت چاہیے منظور یا ملا ہے یا میری بابت کا

یقین کر لیں کہ اشہد اللہ علی ما فی قلبی -

میری حالت یہ ہے کہ میں اپنے تئیں کو نفوس

ملیں اشہر نہیں سمجھتا آپ چاہیں بے تکلف مرے بیانہ

ہضم النفس سمجھیں مگر میں نے تو نفوس کی

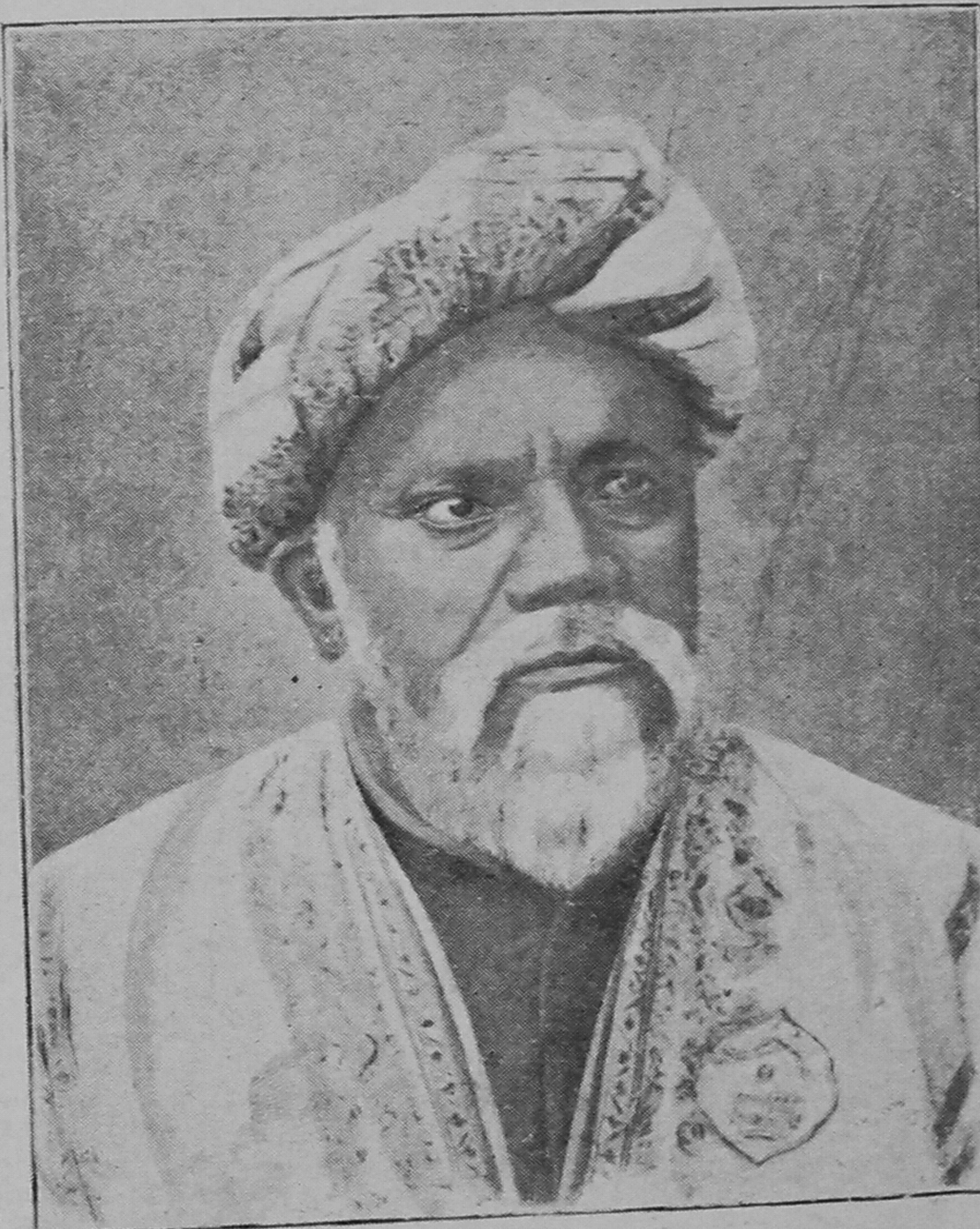
آنکھیں دیکھی ہیں سو احسبہ لنا الحین و لیستہ

سلیم کے متعلق آپ نے میری قتنی صلاحیت ہے دنیا کی
ذہانت سمجھی لا نقیم لہم وزنا - اس کو بعض
لوگ مسجع سمجھ کر بیجا خیال کرتے ہیں مگر خیر الموقع
ایسا نہیں ہے بلکہ سہو ذہن کی سمجھ ہے تعجب
لم یجد فوق نفسہ من مزید - فی الجملہ آپ کے
اعداد پر نظر کرتے ہوئے میں آپ کو
روک تو نہیں سکتا مگر آپ کے اس عمل
کو نظر استحسان سے بھی نہیں دیکھتا

دہلی ۵ فروری ۱۹۱۰ء

نذیر احمد

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی ڈی،





مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب

مرزا فرحت اللہ بیگ
بہ زمانہ طالب علمی

MIRZA FARHATULLAH BEG

مولوی نذیر احمد کی کہانی
کچھ انکی اور کچھ میری زبانی

اللہ اللہ ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور داؔنی مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ ان کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی۔ ان کا طرز بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا، ان کی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی، ان کی تکلیفیں خود ان کو پُر نم اور ہم کو تڑپاتی تھیں۔ اور آج وہ دن ہے کہ ان کے حالات زبان قلم پر لانے سے ڈر لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی "اخوت اسلامی کا سبق پڑھے ہوئے تھی۔ اس کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا وہ چھوٹے درجہ سے بڑے درجہ پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا وہ کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑا۔ وہ اپنے دست و بازو کے

ف ا ۔ ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب O.B.E سابق ناظم آثار قدیمہ وحال سکریٹری مجلس مخطوطات فارسیہ کی طرف اشارہ ہے۔

بھروسے پر اس میدان میں اُترا۔ ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا۔ اور دنیا پر بخوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری و مددگاری ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو باآسانی ہٹائی نہ جاسکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ (I AM A SELF MADE MAN) کا فقرہ ضرور استعمال کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا جو کچھ کرنا ہے خود کرو۔ باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان فطرت سے مجبور ہے۔ جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اصلاحی سبق سے بے خبری۔ ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے جو اپنے آبا و اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ان کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ میاں اگر لفٹنٹ گورنر کے بیٹے ہو تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ۔ دس روپئے کے اہلکار ہو کر باپ کو لفٹنٹ گورنر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔

بہر حال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب

مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا۔ بہت کچھ لکھ لیا تھا وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں انجن چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ لیکن رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق[۱] صاحب کا کہ انھوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالۂ قلم کرنے پر آمادہ کردیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا، خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا۔ تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کے خوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔ میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے، جس موقع پر جو کچھ سنا یا دیکھا اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو واقعات مولوی صاحب ہی کی زبانی میں بیان کئے جائیں، انشاء اللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔ اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں۔ اگر سچ ہیں تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں، اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدانِ حشر میں سود درسود لگا کر تاوان وصول کرلیں گے۔

اب رہا طرزِ بیان تو اس میں میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں۔

---

[۱] اردو کے محسن اعظم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی طرف اشارہ ہے۔

کیوں کہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منھ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ سید انشاء کو میر اور مارک ٹوئین کو امرسن بنانا ہے۔ جب اپنی زندگی میں انہوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضعداری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعویدار ہوں۔

چل رے خامہ بسم اللہ

سنہ ۱۹۰۳ء میں میں نے اور میاں داؔنی نے ہندو کالج دہلی سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ ایف اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور داؔنی کا عربی تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی اے میں عربی لے لو۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی۔ اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہو گی۔ مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں۔ جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی اے کے درجۂ ابتدائی میں شریک ہو گئے ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے۔ بڑے اللہ والے لوگ تھے۔ عربی کا گھنٹہ بآسانی تصوف کی باتوں میں گزر جاتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ داؔنی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں، کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف و نحو اس میں تو کورا کا کورا ہی رہا۔ سنتے آئے ہیں کہ "مصیبت کہہ کر نہیں آتی"۔ لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ "عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے"۔ ایک دن جو مولوی صاحب

کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفاء دیکر کعبۃ اللہ چلے گئے پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے۔ ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں تو انہوں نے کورا جواب دیدیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ میں نے داتی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی۔ اب میرے کہنے سے تم سائنس لیلو جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا اب اسی سہولت کے مدنظر اپنا مضمون بدلو۔ بقول شخصے کہ "مرتا کیا نہ کرتا" وہ راضی ہو گئے دفتر میں جاکر جو پکڑوں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا۔ پکڑ کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا۔ سنگ آمد و سخت آمد۔ جب "وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے" کی صورت آپڑی تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے، مشورے کئے، رزدلیوشن پاس ہوئے آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ "خاک از تودہ کلاں بردار" کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیے۔ دلّی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے۔ ایک مولوی محمد اسحاق صاحب، دوسرے شمس العلما، مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ایل ایل ڈی اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی۔ اس لئے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی۔ قرعہ دوسرے صاحب پر پڑا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد دہلی میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ ہم دونوں نے بھی جاکر شام ہی سے جامع مسجد کی

سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیئے۔ آٹھ بجے نو بجے دس بج گئے مولوی
صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل خدا خدا کرکے دروازہ سے قندیل نکلتی
ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک کر خوشامد کے فقرے
کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے۔ ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے اس
لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی اس کے بعد جس طرح سمندر
کے کنارے سے جہاز آتا دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب
کا عمامہ اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ سرنگیں آنکھیں، سفید ریش
مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر
آئیں آہستہ آہستہ انہوں نے سیڑھیوں سے اترنا اور اوپر تلے ہمارے
سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے
ہو جائیں وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔ آخر ذرا تیز قدم چل کر ان کو جالیا
اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فراشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی
راہ گیر ہیں، میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کہ
سائل ہیں۔ ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے
اور ہم نے وہی پہلی والی ترکیب کی کہ چکر لگا کر پھر سامنے آ گئے۔ یہ دیکھکر وہ
ذرا ٹھٹھکے۔ پوچھا "میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا کیا مجھ سے کوئی کام ہے۔"
رام کہانی بیان کرکے عرض مدعا زبان پر لائے۔ فرمانے لگے۔ "تم کو معلوم
ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں" بجنسہ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا
کئے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے "تم کو معلوم ہے کہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کا
انسپکٹر ہوں" لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے۔ عرض کیا کہ ہم امتحان
میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ "تم کو

تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے۔ کسی دوسرے کی تلاش کیجیے۔" ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو۔ ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ انہوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دیکر اور نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو۔ وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں۔ مگر مولوی صاحب کے طرز عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کوئیں کی گلی میں گھس اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو اُمید نمبر ۲ پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے ایسے رستم کو پکڑنے کے لئے شغال بننا ضرور ہے۔ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور رزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبد الرحمٰن[1] کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبد الرحمٰن صاحب کا حال بھی سن لیجئے۔ ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا، نہایت نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ جوتوں کی دوکان تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب اس دوکان کو ہمیشہ رحمتی مدد دیا کرتے تھے۔ اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے۔ عبد الرحمٰن گو میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں

ف[1] ۔ یہ دہلی کے بڑے وکیلوں میں تھے، اور اب پاکستان میں چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز ہیں۔

میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا چنانچہ انہی کی وجہ سے عبدالرحمٰن نے بی اے ایل ایل بی کے امتحانات پاس کئے۔ انہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایف اے میں پڑھتے تھے۔

بہر حال اسکیم تیار ہوگئی اور دوسرے ہی دن سے میں نے عبدالرحمٰن کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد ان سے اظہار مطلب کیا۔ کہنے لگے کہ "بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے" کہیں انکار نہ کر بیٹھیں میں نے کہا کہ "میاں عبدالرحمٰن تم ان تک ہم کو پہنچا دو اگر ہوسکے تو ایک دو کلمۂ خیر بھی ہمارے حق میں کہدو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت" وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ "شام کو آٹھ بجے دوکان پر آجانا میں مولوی صاحب سے ملوادوں گا"۔ "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں"۔ ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دوکان پر پہنچے۔ یہ دوکان فتح پوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فرشی سلام کئے اور خاموش تخت کے کونہ پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی۔ عبدالرحمٰن ہمارے پاس آ بیٹھے۔ مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا، میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا۔ دھتکار سنکر یہاں سے بھی بکلنا پڑے گا۔ سچ ہے مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔ "مرتا کیا نہ کرتا" میں نے یہی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اس پار، مولوی ضیاالدین

صاحب تو بچ کر نکل گئے لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے
قصۂ مختصر مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب
کون ہیں۔ عبدالرحمٰن نے ہمارے نام بتائے۔ کچھ الٹے سیدھے خاندانی حالات
بھی بیان کئے۔ اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش
ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا "برائے برستے کھیلا جوا، آج نہ ہوا کل ہوا" اب
میاں عبدالرحمٰن کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ
یہاں سے بھی بے نیل مرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رقت آمیز
لہجے میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا۔ فرمانے لگے "تو عربی چھوڑ دو،
سائنس پڑھو۔ بیٹا آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے
یہاں مثل ہے۔ پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔ فارسی
پڑھ کر تیل تو بیچ لو گے، عربی پڑھ کر تیل بھی بیچنا نہ آئے گا۔" ان کی اس
پُر مذاق گفتگو سے ہم دونوں کے دل بڑھ گئے۔ ہم رہنے والے ٹھہرے
جامع مسجد کے نیچے کے، بھلا ایسی باتوں میں ہم سے کون ور آسکتا ہے
ہم نے بھی ایسے ہی شگفتہ الفاظ میں جواب دیا۔ مولوی صاحب پہلے تو
مسکراتے رہے اس کے بعد کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ داغی کی طرف اشارہ کر کے
کہنے لگے کہ "یہ بڑا غریب معلوم ہوتا ہے مگر تو بڑا بدمعاش ہے۔ بیٹا جاؤ کسی
دوسرے مولوی صاحب کی تلاش کرو۔ دلی میں کیا مولویوں کا کال ہے۔ مجھے
ذرا بھی فرصت ہوتی تو کبھی انکار نہ کرتا۔" میں نے عرض کی کہ "جناب والا
کا ارشاد بالکل صحیح ہے مگر جو مولوی ہیں وہ پڑھاتے نہیں اور جو پڑھاتے
ہیں وہ مولوی نہیں ہیں۔" کہنے لگے "نہیں ایک آدھ ایسا بھی نکل آئے گا
جو مولوی بھی ہوگا اور پڑھائے گا بھی۔ جناب شمس العلماء مولوی ضیاءالدین صاحب

ایل ایل ڈی (یہ الفاظ بہت طنز سے کہے) کے پاس جاؤ۔ ان کو فرصت بھی ہے اور عالم بھی ہیں۔" میں نے کہا کہ" اس کے ساتھ وہ پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی ہیں۔" کہنے لگے" میں اس کا مطلب نہیں سمجھا۔" یہاں تو جلے بیٹھے ہی تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں والا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ" بھئی تم لونڈوں سے ڈرنا چاہئے ضیاء الدین کو اگر خبر ہو جائے کہ ان کے اوصاف حمیدہ و خصائل پسندیدہ سراج الدین کی دوکان پر اس طرح معرض بحث میں آتے ہیں تو یقین جانو کہ نالش ٹھونک دیں۔ اچھا بھئی میں تم کو پڑھاؤں گا۔ مگر تم بھاگ جاؤ گے۔ ہم دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا" نہیں، ہرگز نہیں" مولوی صاحب نے کہا کہ" چھٹی ایک دن کی نہ ہوگی" ہم نے کہا" بہت خوب" مولوی صاحب نے کہا کہ" عید، بقرعید کو بھی آنا پڑے گا" ہم نے کہا کہ" بہت مناسب۔ کل کس وقت حاضر ہوں" مولوی صاحب تھوڑی دیر تک انگلیوں پر کچھ اپنے وقت کا حساب کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا" دوپہر کو ڈیڑھ بجے" ہم نے کہا" بہت خوب" چونکہ ان باتوں میں رات زیادہ ہو گئی تھی اس لئے مولوی صاحب دوکان پر سے اٹھے۔ ہم سب نے سلام کیا اور وہ وعلیکم السلام کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ یہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سراج الدین صاحب نے وقتاً فوقتاً ہماری ہاں میں ہاں ملا کر اس فیصلے میں بڑی مدد کی۔ ہم دونوں بھی خوش خوش اٹھے اور سلام علیکم وعلیکم السلام کر کے دوکان سے چلے۔ راستے میں داغی نے کہا" میاں مرزا بڑے میاں نے مار ڈالا۔ بھئی گیارہ بجے کالج سے پڑھ کر نکلیں گے، کشمیری دروازے سے چل کر چوڑیوالوں آتے آتے ساڑھے گیارہ بج جائیں گے۔ دم نہ لینے پائیں گے کہ مولوی صاحب کے

ہاں چلنے کی تیاری کرنی پڑیگی۔ کہاں چاوڑی[1] اور کہاں کھاری[2] باولی
جون کا مہینہ کہیں راستہ میں لو لگ کر ٹیں نہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔
"میاں داتی کچھ دنوں چلکر دیکھو شاید مولوی صاحب کو رحم آجائے" مگر
ان کو آخر تک رحم نہ آنا تھا نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ جاڑوں میں صبح ساڑھے
چھ بجے سے تعلیم کا وقت مقرر ہوا۔ لیکن ایمان کی بات ہے کہ مولوی صاحب
ہی کی ہمت تھی جو وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے۔ بیچاروں کا ایک
منٹ خالی نہ تھا۔ اور انھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام
کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا۔ تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے
رہے۔ نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت
بار لگنے کا لفظ زبان پر لائے۔ نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا۔
یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ "بیٹا جب تم دونوں آتے
ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بو پاتا ہوں۔
میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ جس
طرح ہم نے پڑھا ہے۔ کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ اس زمانے کے لونڈوں
پر اگر ایسی بپتا پڑے تو گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ مگر (میری طرف دیکھ کر)
استاد تم سے مجھے کچھ توقع نہیں۔ تم صرف بی اے پاس کرنے کی فکر میں ہو
داتی کو شوق ہے یہ عربی میں ترقی کرے گا۔ مگر تم کورے کے کورے ہی
رہو گے۔ اور انشاء اللہ پانچ چھ ہی برس میں میری ساری محنت اکارت
کر دوگے" خدا کے فضل سے ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

له ۱ - دہلی کے ایک محلہ کا نام له ۲ دہلی کے دوسرے محلہ کا نام۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں میں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت، ان کے رہنے سہنے کے طریقے اوران کے مشاغل کا نقشہ کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں تاکہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ لیکن سینو میٹو گراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں۔ کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائے گی۔ لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے۔ اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی ان کے حالات لکھتے وقت میری ہی طرح معافی مانگنی پڑتی۔ ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی ٹھوٹھ ملّا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس وقت بھی لکھتے لکھتے پنسل ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں۔ اور ایک عالم بے خودی مجھ پر چھا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی کوئی بات نہ تھی جس میں خوش مذاقی کا پہلو نہ ہو۔ کوئی قصہ نہ تھا جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر نہ بھری ہو۔ کوئی طرز بیان نہ تھا جو ہنساتے ہنساتے نہ لٹا دے۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم (اور خاصکر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مقطع اور مسمسے شاگردوں سے نفرت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ " ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں "!

لیجئے اب مولوی صاحب کا حلیہ سنئے۔
رنگ سانولا مگر رو کھا قد خاصہ اونچا تھا۔ مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دُہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمردوں کا تھیلا ہو جاتا ہے بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔ گرمیوں میں تہمد (تہ بند) باندھتے تھے۔ اس کے پلو اڑسنے کی بجائے اِدھر اُدھر ڈال لیتے تھے مگر اٹھتے وقت بہت احتیاط کرتے تھے۔ اول تو قطب سے بیٹھے رہتے تھے۔ اگر اٹھنا ہوا تو پہلے اندازہ کرتے تھے کہ فی الحال اٹھنے کو ملتوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ضرورت نے بہت ہی مجبور کیا تو ازار بند کی گرہ یا تہمد کے کونوں کے اڑسنے کا دباؤ توند پر ڈالتے تھے۔ سر بہت بڑا تھا۔ مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا۔ جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے۔ ورنہ بالوں کی یہ گگر سفید مقیش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ انگن تھیں۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے۔ بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو "مسکراتی ہوئی آنکھیں" کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ کلہ، جبڑا

بڑا زبردست پایا تھا۔ چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا۔ اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لئے گنجائش بڑھادی تھی۔ اس لئے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔ آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے جو سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے۔ اسی لئے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف صاف سنائی دیتا تھا۔ ناک کسی قدر چھوٹی تھی۔ اور نتھنے بھاری۔ ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں "گاجر" اور دلی والوں کی بول چال میں "پھلکی" کہا جاتا ہے۔ گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دیتی تھی۔ داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا۔ گلے تو کبھی قینچی کے منت کش ہوئے البتہ ٹھوڑی پر کا حصہ کبھی کبھی ہموار کرا لیا جاتا تھا۔ داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنا دی تھی۔ بالوں میں سے ٹھوڑی اس طرح دکھائی دیتی تھی جیسے اکس ریز (X Rays) ڈالنے سے کسی بکس کے اندر کی چیز۔ ٹھوڑی چوڑی اور ان کے ارادے کے پکے ہونے کا اظہار کرتی تھی۔ گردن چھوٹی مگر موٹی تھی۔

لیجئے یہ ہیں مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

اب رہی لباس کی بحث تو ان کا بھی حال سن لیجئے۔ جنھوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے کشمیری جبہ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انہوں نے عالی جناب شمس العلما مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل ایل ڈی مدظلہ العالی کو دیکھا ہے، مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا

ان کے گھر کے اور باہر کے بیاس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مدہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی، جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً نزکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھکر نکلتے تھے گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پیجامہ ہوتا۔ اور جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن یا کشمیری کام کا جبہ۔ چونکہ سراج الدین صاحب سے لین دین تھا اس لئے لال نری کا سلیم شاہی جوتہ زیادہ استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کے لئے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔ انہی کا پاؤں تھا کہ ان چینیوں کے سے سخت جوتوں کی برداشت کرتا تھا جرابوں سے انھیں ہمیشہ نفرت تھی۔ گو دربار میں جانے کے لئے دو ایک جوڑیاں پاس رہتی تھیں۔ یہ تو پبلک کے مولوی صاحب ہوئے۔ اب ہمارے مولوی صاحب کو دیکھئے۔ آئیے میرے ساتھ چوڑیوالوں سے چلئے، چوڑیوالوں سے نکل کر چاوڑی میں آئیے، الٹے ہاتھ کو مڑ کر قاضی کے حوض پر سے ہوتے ہوئے سرکی والوں پر سے گزر کر لال کنوئیں پہنچیے۔ آگے بڑھے تو بڑیوں کا کٹرہ ہے۔ وہاں سے آگے چل کر نئے بانس میں آئیے۔ یہ سیدھا راستہ کھاری باؤلی کو نکل گیا ہے نکڑ سے ذرا ادھر ہی داہنے ہاتھ کو ایک گلی مڑی ہے، یہ بتاشے والوں کی گلی ہے۔ بتاشے بنتے ہوئے ہم نے سب سے پہلے یہیں دیکھے۔ یہاں اچار چٹنیوں والوں کی بیسیوں دکانیں ہیں۔ انہی دکانوں کے بیچ میں سے ایک گلی سیدھے ہاتھ کو مڑی ہے۔ تھوڑی ہی دور جا کر بائیں طرف ایک

اتا م ۱ - یہ سب دہلی کے محلوں کے نام ہیں۔

پتلی سی گلی اس میں سے کٹ گئی ہے۔ اس گلی میں پہلا ہی مکان مولوی
صاحب کا ہے۔ مکان دو منزلہ ہے اور نیا بنا ہوا ہے۔ صفائی کی یہ حالت
ہے کہ تنکہ پڑا ہوا نظر نہیں آتا۔ دروازے کے باہر دونوں پہلوؤں میں دو سنگین
چوکیاں ہیں۔ دروازے کو عبور کرنے کے بعد صحن میں آتے ہیں۔ صحن کسی قدر چھوٹا
ہے۔ سیدھی طرف دفتر ہے جہاں اکثر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے کلام مجید پڑھا
کیا کرتے ہیں۔ اس کے مقابل بائیں طرف باورچی خانہ ہے، چولھے بنے ہوئے
ہیں، آگ جل رہی ہے۔ مگر برتن اور ہنڈیاں وغیرہ جو باورچی خانہ کا جزو لاینفک
ہیں سرے سے ندارد ہیں۔ آگ صرف حقہ کے لئے سلگائی جاتی ہے۔ کھانا
دوسرے گھر سے پک کر آتا ہے۔ دروازہ کے بالکل سامنے اکہرا دالان ہے
اور اندر ایک لمبا کمرہ۔ گرمی کا موسم ہے اور مولوی صاحب ایک چھوٹی سی
میز کے سامنے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کمرے کے دو دروازے بند ہیں ایک
کھلا ہے۔ باہر ایک بڑھیا پھوس چماری بیٹھی پنکھے کی رسی کھینچ رہی ہے۔ ہاں
تو میں کیا تصویر دکھانا چاہتا تھا؟ مولوی صاحب کا لباس۔ مگر خدا کے فضل
سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے۔ جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتہ ہے
نہ ٹوپی، نہ پیجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے،
بندھی ہوئی نہیں ہے محض لپٹی ہوئی ہے۔ لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز
ہے۔ کمرے میں نہایت اجلی چاندنی کا فرش ہے۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا
ہے کبھی اس پر چادر ہے کبھی نہیں ہے۔ سرھانے تکیہ رکھا ہے مگر اس
کی رنگت کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ البتہ جس گاؤ تکیہ سے مولوی صاحب
لگے بیٹھے ہیں وہ بہت صاف ہے۔ قالین بھی عمدہ اور قیمتی ہے۔ اگر مولوی
صاحب کی حالت دیکھکر آپ سوال کر بیٹھیں کہ "مولانا ایں چہ کرامت کردہ"

توانشاء اللہ یہی جواب ملے گا کہ "محتسب را درون خانہ چہ کار" جاڑوں میں مکان کے اوپر کے حصے میں رہتے تھے چلیے وہاں کا بھی رنگ دکھا دوں۔ صدر دروازے سے ملا ہوا زینہ ہے اور سیڑھیوں کے ختم ہونے پر غسلخانہ اور بیت الخلاء ہے۔ اس کے بعد ایک دروازہ آتا ہے۔ دروازہ سے گذر کر چھت پر آتے ہیں۔ سامنے ہی ایک کمرہ ہے اور اس کے دونوں جانب کوٹھریاں۔ غسل خانے کے بالکل مقابل دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ آخر میں مولوی صاحب یہیں رہا کرتے تھے۔ جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے تو ان کی نشست سامنے والے بڑے کمرے میں تھی۔ یہاں بھی چاندنی کا فرش ہے اس پر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ، سامنے ایک چھوٹی نیچی میز، پہلو میں حقّہ۔ اس کی حقیقت کیا حقہ، بیان کرنا مشکل ہے۔ مولوی صاحب کو حقہ کا بہت شوق تھا۔ مگر تمبا کو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ اس کے دھوئیں کی کڑواہٹ بیٹھنے والوں کے حلق میں پھندا ڈال دیتی تھی۔ فرشی قیمتی تھی مگر چلم پیسے کی دو والی اور نیچہ تو خدا کی پناہ۔ اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے مدت کی محو ہو چکی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایک صاحب نے نیچہ بدلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مترادف قرار دیکر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو کر رہ گئے۔ خیر جاڑے کا موسم ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور بڑھا رہے ہیں۔ سر پر کنٹوپ ہے۔ مگر بڑا دقیانوسی۔ کبھی کانوں کو ڈھکے ہوئے اور ڈوریاں نیچے لٹکتی ہوئیں، کبھی اس کے دونوں بازو اوپر کی طرف سیدھے کھڑے ہو کر لاٹ پادری کی ٹوپی کا نمونہ بن جاتے اور ڈوریاں طرّے کا کام دیتیں، کبھی بازوؤں کو سر پر اوپر تلے ڈوریوں

سے کس دیا جاتا اور اس طرح کنٹوپ فلٹ کیپ کی شکل اختیار کر لیتا.
جسم پر روئی کی مرزئی. مگر ایسی پرانی کہ اس کی روئی کی گرمی مدت سے
مائل بہ سردی ہو چکی ہے. اوپر صندلی رنگ کا دھسہ پڑا ہوا. لیجئے
دیکھا آپ نے ہمارے مولوی صاحب کو چار بجے اور مولوی صاحب نے
آواز دی "پانی تیار ہے" جواب ملا "جی ہاں" مولوی صاحب غسلخانے
میں گئے. کپڑے بدل دیا یوں کہو کہ جون بدل) باہر نکل آئے اور چلے
ٹاؤن ہال کو. اب یہ ہمارے مولوی صاحب نہیں رہے، آپ کے مولوی
صاحب ہو گئے.

گھر میں اس لباس سے استغناء کے کئی باعث تھے. اول تو
یہ بات تھی کہ ان کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہیں تھی. پڑھنے پڑھانے
اور لکھنے لکھانے میں ان کا دن گزر جاتا تھا. دوسرے یہ کہ وہ بہت
کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے. جس کو ملنا ہوتا تھا شام کو ٹاؤن ہال
کی لائبریری میں ان سے جا کر مل آتا تھا. جو لوگ مکان پر آتے تھے
وہ یا تو ان کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال. اور ظاہر ہے کہ
ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے. یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی
صاحب ہیں کتنے پانی میں. لباس سے اس بے اعتنائی کی تیسری وجہ یہ تھی
کہ وہ اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے کسی دوسرے کا دولت خانہ نہیں جانتے
تھے. ان کو جس طرح آرام آتا اس طرح رہتے. جی چاہتا پہنتے نہ جی
چاہتا نہ پہنتے. البتہ جب باہر جاتے "تو کھائے من بھاتا پہنتے جگ بھاتا"
پر عمل کرتے. اصل عالم تو گھر پر تھے. باہر نکل کر ظاہری عالم بھی بن جاتے
سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی

باتوں کا خیال رکھتی۔ یا کم سے کم ان کا کنٹوپ، مرزئی یا سرھانے کے تکیہ کا غلاف تو بدل دیا کرتی۔ گھر میں تھا کون، ایک مولوی صاحب، دوسرا ایک کاٹرا ٹٹو بار بردار نفر۔ ان کا نوکر خدا بخش، وہ بھی ایسا بے پرواہ کہ خدا کی پناہ۔ ظالم نے بہرا بن کر کام سے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مولوی صاحب کی آواز جس سے مردے قبر میں چونک پڑے اس کو کبھی نہ سنائی دے اور جب تک کسی نے جا کر اس کا شانہ نہ ہلایا اس نے ہمیشہ سنی کو ان سنی کر دیا۔ البتہ حقہ کے معاملہ میں بڑا تیز تھا۔ یا تو اس کو یہ خیال تھا کہ حقے بغیر مولوی صاحب کے ہاں گزارہ ہونا دشوار ہے یا یہ وجہ تھی کہ تمباکو زیادہ صرف کرنے سے اس کو دو ایک پیسے روز مل جاتے تھے۔ غرض یہ حال تھا کہ حقہ پورا سلگا بھی نہیں ہے اور وہ چلم اٹھا کر لے چلا۔ مولوی صاحب ہاں ہاں کرتے ہی رہے اس نے جا چلم الٹ دی۔ دوسرا اسلفہ رکھ آگ بھر، چلم حقہ پر لا کر رکھدی۔ تو اگرم حقہ بھڑک گیا۔ میاں نوکر کو پھر بلا کر تو اٹھنڈا کرنے اور چلم بھروانے کی ضرورت پیش آئی۔ غرض سارے دن ان کا یہی کام تھا اور وہ اس میں خوش اور بہت مگن تھے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ لوگ اس کو دیکھ کر اپنی گھڑیاں ٹھیک کر لیتے تھے بعض یورپ پرست اس کی پابندیٔ اوقات کو یورپ والوں کا ہی حصہ خیال کریں تو خیال کریں میں تو یہ کہتا ہوں کہ صرف دہلی میں میں نے تین ایسے شخص دیکھے ہیں جو آندھی آئے مینہ آئے روزانہ چھ بجے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں آتے تھے ادھر انہوں نے لائبریری کے دروازے

میں قدم رکھا اور ادھر گھنٹہ گھر نے چھ بجائے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک مشرق میں رہتا تھا تو دوسرا مغرب میں۔ یہ تین شخص کون تھے۔ ایک منشی ذکاء اللہ صاحب دوسرے رائے بہادر پیارے لال صاحب اور تیسرے مولوی صاحب۔ ایک چیلوں کے کوچہ سے آتا تھا۔ دوسرا دریبہ سے اور تیسرا کھاری باؤلی سے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک نے آکر دوسرے کا انتظار کیا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک نہ آتا تھا تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ کہ نہ آنے والا ایسا بیمار ہے کہ چلنا دشوار ہے۔ اور یہ نتیجہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے کہ اگر کسی شخص کو ان تینوں میں سے کسی سے ملنا ہوتا اور چھ بجے سے ذرا پہلے لائبریری کے کسی ملازم سے جاکر دریافت کرتا تو یہی جواب ملتا کہ "اب آتے ہی ہوں گے چھ میں دو ہی منٹ تو رہ گئے ہیں۔ دوسرے دو صاحبوں کا ٹائم ٹیبل تو مجھے معلوم نہیں البتہ مولوی صاحب کی مصروفیتوں کا حال لکھتا ہوں۔ ان کے اس نظام اوقات میں گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے کچھ تغیر ہوجاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔

گرمیوں میں اٹھتے ہی نہاتے تھے اور ضروریات سے فارغ ہوکر نماز پڑھتے۔ ان کی صبح کی اور عصر کی نماز کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی۔ باقی کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ نہ میں نے دریافت کیا اور نہ مجھ سے کسی نے کہا۔ صبح کی نماز پڑھکر کچھ تلاوت کرتے۔ ادھر ذرا دن چڑھا، ادھر مولویوں کی جماعت اور خود مولوی صاحب کا ناشتہ داخل ہوا۔ اس جماعت میں بخارا، کابل، سرحد وغیرہ کے لوگ تھے۔ ان کی تعداد کوئی ۱۵، ۱۶ تھی۔ محنت ایسی کرتے تھے کہ دوسرا کرے تو مرجائے لیکن ٹھوٹھا ایسے تھے کہ مولوی صاحب بھی زچ ہوجاتے

تھے۔ خوش مذاقی تو انھیں چھو کر نہیں نکلتی تھی۔ خود مذاق کرنا تو کجا دوسرے کا مذاق بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ متانت اور ادب کا یہ حال تھا کہ آنکھ اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھنا سو ادبی سمجھتے تھے۔ اب ان کے "وہ عمامے اونچے اونچے یہ یہ لمبی ڈاڑھیاں" دیکھو اور مولوی صاحب کی حالت کا اندازہ کرو بچارے ناشتہ کرتے جاتے اور اپنا فرض اتارتے جاتے تھے۔ عالم تھے دوسروں کو عالم بناتے تھے۔ لیکن کہا کرتے تھے کہ "ان فتحپوری کے ملّانوں کو پڑھا کر میرا دل بیٹھ جاتا ہے کیا کہوں۔ میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں کا نقشہ ہے" یہ جماعت اٹھی اور مولوی رحیم بخش صاحب آنازل ہوئے۔ کاغذوں کا مٹھا بغل میں، ہاتھ میں پنسل، کان میں قلم، ادھر فتحپوری کی جماعت نے کمرہ سے قدم نکالا ادھر انہوں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ اب سلسلہ تصنیف و تالیف شروع ہوا۔ چونکہ آخر میں مولوی صاحب کے ہاتھ میں رعشہ آگیا تھا، اس لئے لکھوانے کا کام اکثر انہیں سے لیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے کلام مجید اور حمائل شریف کی کاپیوں کی صحت کی جاتی۔ اس کے بعد مطبع کا حساب دیکھا جاتا اور پھر جدید تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ کام سمٹتے سمٹتے ساڑھے گیارہ پونے بارہ بج جاتے رحیم بخش صاحب کے اٹھتے ہی کھانا آتا۔ کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ادھر ڈیڑھ بجا اور ادھر ہم دونوں داخل ہوئے ہمارا قدم رکھنا تھا کہ مولوی صاحب اٹھ بیٹھے۔ ساڑھے تین بجے تک ہم سے سر مغزنی کرتے رہے اگر کوئی دلچسپ بحث یا قصہ چھڑ گیا تو چار بج گئے۔ چار بجے اور مولوی صاحب غسل خانہ میں گئے۔ نہائے دھوئے کپڑے پہن نکل کھڑے ہوئے پہلے شمس العارفین کی دوکان پر ٹھیرے۔ یہاں بھی ان کا حساب کتاب تھا۔ وہاں کا کھاتہ دیکھا

جو کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور سیدھے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں پہنچ گئے سات بجے تک وہاں ٹھیرے جس کو ملنا ہوا وہ وہاں مل لیا. سات بجے وہاں سے اٹھکر سراج الدین صاحب کی دوکان پر آئے یہاں بھی حساب کتاب کیا. عبدالرحمٰن کو پڑھایا. گھنٹہ بھر یہاں ٹھیر کر مکان پہنچ گئے. کھانا کھایا کچھ لکھا پڑھا اور دس بجے سو رہے. جاڑے میں پروگرام میں یہ تبدیلی ہو جاتی تھی کہ پہلے صبح ہی صبح ہم پہنچتے تھے اسکے بعد مولویوں کی جماعت آتی تھی، رحیم بخش صاحب کا نمبر سہ پہر میں آتا تھا۔

خوش خوراک تھے اور مزہ لے لے کر کھاتے تھے. ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے. میوہ کا بڑا شوق تھا. ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا. بڑھاتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے. مگر مجھکو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلا کرتے ان کے لئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے منھ میں زیرہ ہو جاتا. البتہ ہم دونوں کی صلا نہ کرنا غضب تھا. کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے"! "میاں کیا مزہ کا آم ہے"! مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے. میں نے تو تہیہ کر لیا تھا. (میاں ذاتی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منھ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔

مولوی صاحب کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور اس غرض کے حاصل کرنے میں ان کو مالی مدد دینے میں کبھی انکار نہ ہوتا تھا. بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور اکثر بڑی بڑی رقمیں ڈبو بیٹھتے تھے۔ کہا کرتے تھے "میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق میں تین لاکھ

روپیہ کھو بیٹھا ہوں پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں سے فائدہ پہنچا ہے اس نے میرے نقصان کی تلافی ہی نہیں کر دی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے۔ بیٹا تم بھی تجارت کرو۔ روپیہ میں دیتا ہوں۔ نوکری کی کھکھیڑ اٹھاؤ گے تو مزا معلوم ہوگا"۔ جس طرح روپیہ دل کھول کر دیتے تھے اسی طرح حساب بھی بڑی سختی سے لیتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا مینھ قرضداروں کے ہاں ان کا روزانہ چکر نہیں چھوٹتا تھا۔ گئے اور جاتے ہی پہلے "غلق" پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد کھاتہ دیکھا۔ گردی دیکھی سامان دیکھکر بکری کا اندازہ کیا۔ روپیہ جیب میں ڈالا "سلام علیکم وعلیکم السلام" کیا اور چلدیئے۔ دوسرے دوکاندار کے پاس پہنچے اور وہاں بھی وہی پہلا سبق دہرایا۔ کوڑی کوڑی کا حساب دیکھتے اعتراضوں کی بوچھار سے پریشان کرتے اور کہتے جاتے "بھئی حساب جو جو بخشش سو سو"۔ فقرے کے پہلے جزو سے تو بیچاروں کو روزانہ واسطہ پڑتا لیکن دوسرے جزو کا دیکھنا کبھی کسی کو نصیب نہ ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر واقعی بازار کے مندہ ہونے یا کسی اور وجہ سے ان کے کسی قرضدار کا نقصان ہو جاتا یا دیوالہ نکل جاتا تو پھر اس قرضہ کا ذکر زبان پر نہ لاتے ان کو خیال تھا کہ دہلی کے پنجابی تجارت خوب سمجھتے ہیں ان کو دل کھول کر روپیہ دیتے تھے اور اکثر انہیں کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک صاحب جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں مولوی صاحب کے پاس آئے۔ تجارت کا ذکر چھیڑا۔ اور مولوی صاحب کو ولایتی جوتوں کے فائدے کے وہ سبز باغ دکھائے کہ تیسرے ہی روز بلا کسی طمانیت کے گیارہ ہزار روپیہ کا چک مولوی صاحب نے ان کے نام لکھ دیا۔ بڑے ٹھاٹھ سے

سنہری مسجد کے قریب دوکان کھولی گئی۔ مولوی صاحب جاتے گھڑی دو گھڑی وہاں بیٹھتے۔ دوکاندار صاحب کی لچھے دار باتیں سنتے۔ چلتے وقت کچھ روپیہ جیب میں ڈالنے کو مل جاتے اس لئے خوش خوش بغیر حساب کئے گھر آجاتے۔ یہی ٹھوکر تھی جس نے مولوی صاحب کو چوکنا کر دیا تھا اور وہ بغیر حساب کتاب دیکھے روپیہ کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتے تھے۔ قصہ مختصر اصل میں سے دو ڈھائی ہزار روپیہ مولوی صاحب کو تھما اس نے دیوالہ نکال دیا۔ قرقی ہوئی۔ مال نیلام چڑھا اور اس میرے یار نے کل سامان دوسروں کے ذریعہ سے خود خرید لیا۔ مولوی صاحب کو اس چال کی کانوں کان خبر نہ ہوئی اس کے بعد آیا، بہت رویا، بہت آنسو بہائے، مولوی صاحب سمجھے بچارے کو بڑا رنج ہوا۔ کہا "جاؤ بھئی جاؤ، تجارت میں یہی ہوتا ہے۔ یا اس پار یا اس پار"۔ چلو گئی گذری بات ہوئی۔ ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ یہ چاوڑی میں جا رہے تھے، کچھ جھٹپٹا ہوا تھا کیا دیکھتے ہیں کہ دوکاندار صاحب خوب بنے ہوئے، عطر میں بسے، پھولوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے ایک رنڈی کا ہاتھ پکڑے کوٹھے سے اترے اور آکر ایک کھلی گاڑی میں سوار ہوئے۔ مولوی صاحب نے جو یہ رنگ دیکھا تو وہیں ٹھٹک گئے۔ اتنے میں انہوں نے بھی مولوی صاحب کو دیکھا۔ بہت مسکرا کر سلام کیا۔ رنڈی نے چپکے چپکے کچھ دریافت کیا تو ایک قہقہہ لگایا اور اونچی آواز میں کہا کہ "یہ سب کچھ مولوی صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے"۔ مولوی صاحب کے آگ لگ گئی دوسرے دن ہی نالش ٹھونک دی اور آخر ان کو ٹھکانے لگا کر دم لیا۔ لوگوں نے سفارشیں بھی کیں، انہوں نے خود بھی آکر بہت کچھ توبہ تلہ کی لیکن یہ نہ ماننا تھا

نہ مانے۔ اور آخر جب اس کو ٹھک کر دیا اس وقت ان کو چین آیا۔

دین لین سب کچھ کرتے تھے مگر حساب کتاب صرف دوسروں کی کتابوں یا ان کے دل میں تھا۔ کچھ تھوڑا بہت لوگوں کے کہنے سننے سے متفرق پرچوں پر لکھ بھی لیا تھا۔ لیکن اتنے بڑے بیوپار کے لئے جیسا دفتر چاہیئے وہ انھوں نے نہ رکھنا تھا نہ رکھا۔

سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے۔ اگر کوئی حجت کرتا تو ہمارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ ایک تو حافظ دوسرے عالم تیسرے لسان، بھلا ان سے کون ور آسکتا تھا۔ اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہوگئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لیکر سب کو ادا کر دیا جائے، قرضہ کس سے لیا جائے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا پھر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے "کتنا روپیہ چاہیئے" میں نے کہا "بارہ ہزار" بولے "ضمانت" میں نے کہا "چوڑیوالوں والا مکان"۔ پوچھا "کتنی مالیت کا ہے" میں نے کہا "کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا" فرمایا "کل قبالہ لیتے آنا"۔ میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا۔ دوسرے دن قبالہ لیکر پہنچا۔ پڑھ کر کہا "ٹھیک ہے مگر بیٹا سود کیا دوگے" میں نے کہا "مولوی صاحب آپ اور سود" کہنے لگے "کیوں اس میں کیا ہرج ہے، میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لوگے، اس کو خوشی سے سود دوگے۔ ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین دنیا دونوں میں بھلا ہوگا۔ آخر میں تمہارا استاد ہوں یا نہیں۔ میرا بھی کچھ حق تم پر ہے یا نہیں جاؤ شاباش بیٹا اپنے چچا سے جاکر تصفیہ کر آؤ۔ کل ہی

چک بنگال بنک کے نام لکھے دیتا ہوں" میں نے کہا "مولوی صاحب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لیتے ہیں کس سے اپنے شاگردوں سے"۔ کہنے لگے "اس کی پرواہ نہ کرو جب مجھ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا۔ جاؤ تمہارے ساتھ یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑا لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لوں گا۔" میں نے آکر گھر میں ذکر کیا ہم کو دوسری جگہ سے آٹھ آنے سینکڑے پر روپیہ مل گیا اس لئے یہ معاملہ یونہی کا یونہی رہ گیا لیجئے یہ قصے تو سنا چکا۔ اب اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کے واقعات جو ان کی زبانی سُنے تھے بیان کرتا ہوں۔

ایک روز مولوی صاحب معلقات پڑھا رہے تھے، عمرو بن کلثوم کا قصیدہ تھا جب اس شعر پر پہنچے۔

ابا ھند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

تو بہت ہنسے۔ کتاب رکھدی اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ شعر میں کوئی ہنسی کی بات نہیں پھر مولوی صاحب کو یہ کیا مرض اٹھا ہے۔ آخر جب ہنسنے کا ذرا زور کم ہوا تو وجہ دریافت کی۔ مولوی صاحب پھر ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر بولے "میاں بعض شعر قصہ طلب ہوتے ہیں۔ یہ شعر میری زندگی کے قصے کا آغاز ہی اچھا تو سُناتا ہوں۔ مگر پہلے تمہید سن لو بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے۔ نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔ تعلیم کا شوق تھا اس لئے پھرتا پھراتا پنجاب ہوں کے کٹڑے کی مسجد میں ٹھیر گیا۔ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے۔ ان سے

پڑھتا اور توکل پر گزارہ کرتا۔ مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے۔ انہیں بھی پڑھاتے، مجھے بھی پڑھاتے۔ دن رات پڑھنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ تھوڑے سے دنوں میں کلام مجید پڑھکر میں نے ادب پڑھنا شروع کیا۔ چار پانچ برس میں معلقات پڑھنے لگا۔ گو عمر میری بارہ سال کی تھی مگر قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے نو دس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبڑی ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھدی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخا یا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ انہی کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں جو سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے۔ جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر انہوں نے ٹال دیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا۔ بہرحال مارا دھاڑی روز وہاں جانا پڑتا اور روز ہی مصیبت جھیلنی پڑتی۔ تم سمجھے بھی کہ یہ لڑکی کون تھی۔ میاں یہ لڑکی وہ تھی جو بعد میں ہماری بیگم صاحبہ ہوئیں۔ جب سوچتا ہوں تو پچھلا نقشہ

آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اور بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ اکثر ہم دونوں پہلی باتوں کو یاد کرتے اور خوب ہنستے تھے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ جیسی بچپن میں شریر تھیں ویسی ہی جوانی میں غریب ہو گئیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہماری تو زندگی کا مزا جاتا رہا۔ بھئی دیکھنا میں نے بھی کیسے مزے کی تاریخ کہی ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے عربی کے چار یا پانچ اشعار کا قطعہ سنایا مادہ تاریخ "طھا غفر" تھا۔ میں نے بڑی زور سے "اوں ہوں" کی بگڑ کر میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے"۔ میں نے عرض کی جی نہیں، لیکن اس قطعہ کو سنکر مجھے دبیر کی ایک رباعی یاد آگئی۔ کیا خوب لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہم شان نجف نہ عرش انور ٹھیرا	میزاں میں یہ بھاری وہ سبکتر ٹھیرا
اس پلے میں تھا نجف اور اس پلے میں عرش	پہنچا وہ فلک پر یہ زمین پر ٹھیرا

بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے "یہ تو بے معنی ہے۔ نجف کی جگہ دنیا کی جس چیز کو رکھ دو اس سے یہ رباعی متعلق ہو جائے گی اور وہ عرش سے بھاری ثابت ہو گی"۔ میں نے عرض کی کہ آپ کے قطعہ کو اس سال میں مرنے والی جس عورت سے متعلق کر دو وہ متعلق ہو جائے گا۔ اس تاریخ میں خوبی ہی کیا ہے" اول تو ایسی عام تاریخیں کچھ قابل تعریف نہیں ہوئیں۔ دوسرے سرسید کے تاریخ انتقال "غفرلہ" پر آپ نے صرف الف کا اضافہ کر کے اس کو اپنا مال کر لیا ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے "اچھا بھئی تو ہی سچا سہی۔ اچھا اب اس جھگڑے کو چھوڑو اور میری اصلی کہانی کو لو۔ ہاں تو فرصت کے وقت ہم دہلی کی گلیوں کا چکر لگاتے کبھی کبھی کشمیری دروازہ کی طرف بھی نکل جاتے۔ ایک روز جو کشمیری دروازہ کی طرف گیا تو دیکھا

کہ دھلی کالج میں بڑا ہجوم ہے۔ کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے۔ میں بھی بھیڑ میں گھس گیا۔ معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے مفتی صدرالدین صاحب آئے ہیں۔ ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں۔ برآمدے میں پہنچا۔ قد چھوٹا تھا۔ لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی گیا۔ دیکھا کہ کمرے کے بیچ میں میز بچھی ہے اس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکا آتا ہے اس سے سوال کرتے ہیں اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں۔ میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ مدرسہ کے پرنسپل صاحب تھے۔ تماشے میں محو تھا کہ صاحب کسی کام کے لئے اٹھے۔ چپراسیوں نے رستہ صاف کرنا شروع کیا۔ جو لوگ دروازہ رو کے کھڑے تھے وہ پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے۔ غرض اس دھکا پیل میں میرا قلیہ ہو گیا۔ دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا۔ اس پر میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا۔ اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازہ تک آ گئے تھے۔ انہوں نے جو مجھے گرتے ہوئے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے۔ مجھے اٹھایا۔ پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر کالنقش فی الحجر ہیں۔ باتوں باتوں ہی میں پوچھا "میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو"؟ میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر پوچھا میں نے پھر وہی جواب دیا۔ میری عمر پوچھی۔ میں نے کہا "مجھے کیا معلوم"۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ بجائے اپنے کام کو جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں۔ ذرا دیکھئے تو سہی سچ کہتا ہے یا یونہی

باتیں بناتا ہے۔" مفتی صاحب نے کہا "تو کیا پڑھتا ہے۔" میں نے کہا "معلقات" کہنے لگے "کہاں پڑھتا ہے؟" میں نے کہا "پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں۔" پھر کہا "معلقات دوں، پڑھے گا؟" میں نے کہا "لائیے" انہوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی۔ میرے ہاتھ میں دیدی اور کہا "یہاں سے پڑھ" جس شعر پر انہوں نے انگلی رکھی تھی وہ یہی شعر تھا۔

ابا ھند فلا تعجل علینا وانظرنا نخبرک الیقینا

میں نے پڑھا معنی بیان کیے۔ انہوں نے ترکیب پوچھی وہ بیان کی۔ میاں ذاتی تمہاری طرح میں نے شعر نہیں پڑھا تھا اور مرزا فرحت صاحب تمہاری طرح ترکیب نہیں کی تھی۔ (مولوی صاحب کا یہ اشارہ ہماری کمزوریوں کی طرف تھا اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔) مفتی صاحب بہت چکرائے۔ پوچھنے لگے "تجھ کو کون پڑھاتا ہے۔" میں نے کہا "مسجد کے مولوی صاحب" کہا "مدرسے میں پڑھے گا؟" میں نے جواب دیا "ضرور پڑھوں گا۔" مفتی صاحب نے قلم اٹھا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل صاحب کو دے کر کہا "اس کو پریسیڈنٹ صاحب کے پاس پیش کر دینا۔ ہم وہاں سے نکل اپنے گھر آئے۔ مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا۔ کوئی سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ لے گیا اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل کرنے کی اجازت ہو گئی ہے۔ کل سے آپ اس کو کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجئے۔ اس کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ چپراسی تو یہ حکم دے چلتا بنا۔ مولوی صاحب نے مجھ کو بلا یا خط دکھایا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جب ذرا سختی کی تو میں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز لیجا کر

میرا ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے، میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا۔ ایک تو شوق دوسرے پڑھانے والے ہشیار تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا تھوڑے ہی دنوں میں اپنی جماعت والوں میں سب کو دبا لیا اور اب جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو پہلا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ اور میں بے اختیار ہنسنے لگتا ہوں یہ کہتے ہی انہوں نے لہک لہک کر یہ شعر

ابا ھند فلا تعجل علینا   وانظرنا نخبرک الیقینا

پڑھنا اور ہنسنا شروع کیا۔

میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کی جماعت کہاں بیٹھتی تھی"، کہنے لگے۔ پرنسپل صاحب کے کمرے کے بازو میں جو چھوٹا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی۔ دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت"۔ دانی نے کہا "مولوی صاحب آپ کے اختیاری مضمون کیا تھے"؟ مولوی صاحب ہنسے اور کہا "میاں دانی! ہم پڑھتے تھے آج کل کے طالب علموں کی طرح چوتڑوں سے گھانس نہیں کاٹتے تھے۔ (مولوی صاحب اس فقرہ کا اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہاں کا محاورہ ہے۔) ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے۔ آج کل پڑھاتے نہیں لادتے ہیں۔ آج پڑھا کل بھولے۔ تمہاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی رَدّا ہے، ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں، مٹی بھی ہے، پتھر بھی ہے۔ کہیں کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے۔ ایک دھکا دیا اور آڑا اڑا دھم گر ہی۔ ہم کو اس زمانے میں ایک مضمون پڑھاتے تھے مگر اس میں کامل کر دیتے

تھے پڑھانے والے بھی ایرے غیرے پچکلیاں نہیں ہوتے تھے ایسے ایسے کو چھانٹا جاتا تھا جن کے سامنے آج کل کے عالم محض کاٹھ کے الو ہیں ۔۔ اچھا بھئی اچھا آگے چلو۔

بانا نورد الرایات بیضا ونصدرھن حمرا قد روینا

میں نے کہا مولوی صاحب پہلے شعر کے تو معنی رہ ہی گئے۔ کہنے لگے اتنا بڑا قصہ سنا دیا اس کے بعد بھی اس شعر کے معنوں کی ضرورت ہے۔ پس اس کے یہی معنی ہیں کہ تحقیق ایک ملا کا بیٹا ڈاکٹر ڈپٹی شمس العلماء ایل ایل ڈی ہو گیا، ساتھ آسانی کے بیچ اس دلی کے، بوجہ اس شعر کے مولوی صاحب کی تعلیم کا حال سن چکے۔ اب ہماری تعلیم کا حال سنئے اور قصہ کو سراج الدین صاحب کی دوکان کے واقعہ کے دوسرے روز سے لیجئے۔

میں اور میاں دانی ساڑھے گیارہ بجے مدرسہ سے آئے کھانا دانا کھایا سبق کا مطالعہ کیا اور ایک بجے نکل کھڑے ہوئے۔ مکان کا پتہ پوچھتے پوچھاتے ڈیڑھ میں پانچ منٹ تھے کہ مولوی صاحب کے دروازے پر جا دھمکے۔ دروازے کی ایک چوکی پر میں اور دوسرے پر میاں دانی ڈٹ گئے۔ سامنے ہی کمرہ تھا۔ بی چاری رسی ہاتھ میں لئے اونگھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی رسی کو ایک آدھ جھٹکہ دے دیتی تھیں کمرے کے اندر مولوی صاحب تھے۔ لیکن دروازہ بند تھا۔ اس لئے دکھائی نہ دیتے تھے۔ اب یہ خیال ہوا کہ یہ مولوی صاحب ہی کا مکان ہے یا کسی دوسرے کا۔ اندر زنانہ تو نہیں ہے غرض اس شش و پنج میں تھے کہ مولوی صاحب کے کمرہ کے گھنٹے نے ٹن سے ڈیڑھ بجایا۔ ہم دونوں

اٹھے اور دبے پاؤں چوروں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ گھر میں سناٹا تھا۔ بی چماری نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون جا رہا تھا۔ کمرہ کا ایک دروازہ کھلا تھا اس میں گردن ڈال کر جھانکا۔ چونکہ روشنی سے اندھیرے میں آئے تھے اس لئے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا "کون ہے"۔ اس آواز کو پہچان کر ہم تو سنبھل گئے مگر بی چماری اچھل پڑیں اور بے اختیار ان کے منہ سے گنبد کی آواز کی طرح نکلا "کون ہے" میں نے کہا "میں اور دانی" مولوی صاحب نے کہا "آؤ بیٹا اندر آؤ"۔ مولوی صاحب فوراً پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور تہمد کو سنبھالتے ہوئے نیچے اتر آئے پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ ہم نے کتاب پیش کی۔ تھوڑی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اس کے بعد کہا "بھئی ایک کتاب میرے لئے بھی لیتے آنا" ہم نے اپنی ایک کتاب ان کو دیدی اور دوپہری سے دونوں نے ملکر کام نکالا۔ کب پڑھایا اور کس طرح پڑھایا اس کا میں آئندہ ذکر کروں گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب پڑھ کر اٹھے تو سب کچھ یاد تھا مگر دماغ پر کسی قسم کا بار نہ معلوم ہوتا تھا۔ خوشی خوشی گھر آئے۔ چلو اللہ دے اور بندہ لے۔

ہم نے بھی کالج میں مولوی صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ یہاں تک کہ یہ آواز ہندو کالج کے طلبار کے کان تک پہنچی۔ وہاں کے ایک طالب علم مسٹر رضا کے دل میں گدگدی اٹھی وہ آئے ہم سے ملے اور کہا "بھئی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ مولوی صاحب انکار تو نہ کریں گے" ہم نے کہا "چلو اور ضرور چلو"۔ مولوی صاحب کا

کیا بگڑتا ہے۔ دو کو نہ پڑھایا تین کو پڑھایا۔" انھوں نے کہا "وہ نہیں پہلے مولوی صاحب سے پوچھ لو" ہم نے کہا "یار چلو بھی" اگر انہوں نے کچھ کہا تو ہمارا ذمہ" وہ نہ راضی ہوئے اور یہی کہا کہ پہلے پوچھ لو۔ اس عرصے میں ہماری ہمت مولوی صاحب کے سامنے بہت بڑھ گئی تھی۔ دوسرے دن جاتے ہی رضا کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا "لیتے کیوں نہ آئے" ہم نے کہا "وہ ذرا شرمیلے ہیں۔ بغیر اجازت آنا نہیں چاہتے" انہوں نے کہا "طالب علم شرمیلا ہوا اور ڈوبا۔ خیر کل ضرور ساتھ لانا۔ ذرا ان کا بھی رنگ دیکھ لوں" شام کو واپسی کے وقت جاتے جاتے فراش خانے میں ہم نے رضا کو مولوی صاحب کا اجازت نامہ پہنچا دیا۔ اور کہہ دیا بھئی پورے ڈیڑھ بجے پہنچ جانا ورنہ اندر گھسنا نہ ملے گا۔ دوسرے دن جو ہم پہنچے تو وہ پہلے ہی سے دروازہ پر ڈھئی دیئے بیٹھے تھے۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے ہم اندر داخل ہوئے۔ مولوی صاحب ہم کو دیکھتے ہی پلنگ پر اٹھ بیٹھے اور کہا "لاؤ کتاب" ہم نے کتاب طاق پر سے اتار ان کے ہاتھ میں دی۔ اور وہ کتاب لیتے لیتے نیچے آ بیٹھے اور کہا "اچھا یہ ہیں میاں رضا" بچارے رضا نے گردن جھکا کر کہا "جی ہاں" مولوی صاحب نے کہا "اچھا بھئی شروع کرو۔

ہمارے پڑھنے کا یہ طریقہ تھا کہ ایک روز میں پڑھتا تھا، دوسرے روز میاں دانی۔ اب اس کو ہماری شرارت کہو یا محض اتفاق، ہم دونوں چپکے بیٹھے رہے۔ جب اس خاموشی نے طول کھینچا تو مولوی صاحب نے کہا "ارے بھئی آج تم پڑھتے کیوں نہیں

کیا منہ میں گھنگنیاں بھر کر آئے ہو۔ اچھا میاں رضا تم ہی شروع کرو۔" رضا نے صفحہ پوچھا اور پڑھنا شروع کیا۔ مگر اعراب کی غلطیاں مجھ سے کم کیں تو نظم کو نثر" میاں واقی سے زیادہ بنا دیا۔ ایک آدھ شعر تک تو مولوی صاحب چپکے سنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے "واہ بھئی واہ ہم کو بھی عجب نمونے کے شاگرد ملے ہیں۔ میاں رضا اگر ہم تم کو ایک نیک صلاح دیں تو مانو گے"! رضا نے نہایت شرمیلی آواز میں گردن جھکا کر کہا "بسر و چشم" مولوی صاحب نے کہا "دیکھو اپنے وعدہ سے پھر نہ جانا" انہوں نے کہا "جی نہیں" مولوی صاحب نے کہا اچھا تو میری یہ صلاح ہے کہ کل سے تم میرے ہاں نہ آنا" یہ سنکر وہ بچارے کچھ پژمردہ سے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے کہا "بھئی رضا میں یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاں آنا ہی چھوڑ دو میں تم کو بھی ضرور پڑھاؤں گا۔ مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت کالی جان کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو۔ اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمہارے کانوں کو نظم اور نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا۔ بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھیرتے دیکھا نہیں جاتا۔ بچارے متنبی کو کیا خبر تھی کہ تماشوں کی گلی میں نذیر احمد کے کمرے میں اس کے اشعار مولوی رضا صاحب اس طرح حلال کریں گے"! بچارے رضا کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے سبق ختم ہوا اور ہم سب رخصت ہوئے۔ راستے میں ہم نے ان کو بہت بنایا۔ دوسرے روز سے وہ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔

مسٹر رضا کی حیا کا حال تو سن چکے۔ اب ہماری بے حیائی کی داستان سنئے۔ میری صرف و نحو بہت کمزور تھی اور کمزور کیوں نہ ہوتی شروع کئے

ہوئے کئے دن ہوئے تھے، اعراب میں ہمیشہ غلطی کرتا تھا، نثر کو تو سنبھال لیتا تھا مگر نظم میں دقت پڑتی تھی۔ شعر خود بھی کہتا تھا۔ دوسرد کے ہزاروں اشعار یاد تھے اس لئے شعر کو تقطیع سے گرنے نہ دیتا تھا۔ میاں دانی کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اعراب کی غلطی نہ کرتے تھے مگر شعر کو نثر کردیتے تھے، سکتے تو کیا جھٹکے پڑجاتے تھے۔ مولوی صاحب ہم دونوں کے پڑھنے سے بہت جزبز ہوتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ میرے پڑھنے کی باری تھی۔ میں نے ایک شعر پڑھا۔ معلوم نہیں کہ کہاں کے اعراب کہاں لگا گیا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں کیا پڑھا" میں سمجھا کہ اعراب میں کہیں غلطی ضرور ہوئی۔ تمام اعرابیں بدل کر شعر موزوں کردیا۔ انھوں نے پھر بڑے زور سے "ہوں" کی، ہم نے پھر اعراب بدل دیئے۔ اس سے ان کو غصہ آگیا۔ کہا "دانی تم تو پڑھو"۔ انہوں نے شعر کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ خاصے بھلے چنگے شعر کو نثر بنا دیا۔ اب کیا تھا مولوی صاحب کا پارہ ایک سو دس ڈگری پر چڑھ گیا۔ کتاب اٹھا کر جو پھینکی تو کمرہ سے گزر دالان میں ہوتی ہوئی صحن میں پہنچی، اور نہایت غصیلی آواز میں کہا "نکل جاؤ ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔ نہ تم مجھ سے پڑھنے کے قابل ہو اور نہ میں تمہارے پڑھانے کے لائق"۔ دانی نے میری طرف دیکھا، میں نے دانی کی طرف دیکھا انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا، "چلو" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا "ہرگز نہیں"۔ انہوں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ میں نے ان کا زانو دبا دیا۔ مولوی صاحب کی یہ حالت تھی کہ شیر کی طرح بپھر رہے تھے۔ آخر جب دیکھا کہ یہ لونڈے ٹس سے مس نہیں ہوتے تو کہنے لگے

کہ اب جاتے ہو یا نہیں۔ میں نے کہا "مولوی صاحب جب تک کوئی دھکے دیکر نہ نکالے گا اس وقت تک تو ہم جاتے نہیں اور جائیں گے تو ابھی پھر آجائیں گے"۔ مولوی صاحب نے جو یہ بے حیائی دیکھی تو ذرا نرم ہوئے۔ کہنے لگے۔ "اچھا نہیں جاتے تو نہ جاؤ۔ مگر میں ایک حرف تم کو نہ پڑھاؤں گا"۔ میں نے کہا "نہ پڑھائیے، مگر بغیر پڑھے ہم یہاں سے ہلیں گے نہیں"۔ کہنے لگے "بیٹا اس وقت میری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اب چلے جاؤ، کل آجانا"۔ دانی نے سچ جانا۔ میں سمجھا کہ اس وقت اٹھے اور مولوی صاحب ہاتھ سے گئے۔ دانی اٹھ کھڑے ہوئے میں نے پکڑ کر ان کو بٹھالیا۔ مولوی صاحب یہ تماشا دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "مولوی صاحب پڑھیں گے تو آج پڑھیں گے اور آج پڑھیں گے تو اس وقت پڑھیں گے۔ پڑھانا ہے تو پڑھائیے ورنہ ہم یہاں سے نہ ٹلے ہیں نہ ٹلیں گے۔ آخر کار ہم جیتے اور مولوی صاحب ہارے کہنے لگے "خدا محفوظ رکھے، تم جیسے شاگرد بھی کسی کے نہوں گے۔ شاگرد کیا ہوئے استاد کے استاد ہو گئے۔ اچھا بھئی میں ہارا، میں ہارا، میں ہارا، اچھا خدا کے لئے کتاب اٹھالاؤ اور سبق پڑھکر میرا پنڈ چھوڑو، دیکھئے کون سا دن ہوتا ہے کہ میرا تم سے چھٹکارا ہوتا ہے"! میں جا کر صحن میں سے کتاب اٹھا لایا اور مولوی صاحب جیسے تھے ویسے کے ویسے ہو گئے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر اس روز تم چلے جاتے تو میرے گھر میں گھسنا نصیب نہ ہوتا۔ میں تمہارے شوق کو آزماتا تھا مگر تم نے مجھے ہی آزما ڈالا۔ خدا ایسے شاگرد سب کو نصیب کرے۔ یہ بے حیائی نہیں میاں یہ شوق ہے علم کا جسکو

چسکا ہوتا ہے وہ بُری بھلی سب ہی کچھ سنتا ہے۔ بادشوق بھاگ نکلتے ہیں۔ اور شوقین استاد کو دبا لیتے ہیں۔"

پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی نے کتاب میں سے ایک شعر پڑھا اور مولوی صاحب نے کتاب اُلٹ کر میز پر رکھدی پہلے داغی کی طرف متوجہ ہوئے اور صرف ونحو کے نکات پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں مجھے بارہ پتھر باہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ کبھی میں نے دخل بھی دیا تو مولوی صاحب نے فرمایا۔ آپ مہربانی کرکے اس بارے میں اپنے دماغ پر زور ڈالنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیے۔" اس کے بعد معنی بیان کئے، نکات بتائے اور پھر اسی مضمون کے شعر اور مقولوں کا سلسلہ چھڑا۔ اب میاں داغی خارج از بحث ہو گئے۔ اول تو مجھے یونہی ہزاروں شعر یاد تھے۔ دوسرے خاص طور پر تیار ہو کر جاتا تھا مولوی صاحب اگر ایک شعر پڑھتے تو میں دو پڑھنے کو تیار ہو جاتا۔ غرض جب فریقین اپنا ہندوستانی گولہ بارود ختم کر چکے تو یورپ اور انگلستان کے شعراء اور فلسفیوں کے مقولوں کا نمبر آتا۔ اس میں داغی بھی شریک ہو جاتے۔ اگر کوئی قصہ طلب شعر ہوا اور اسی قسم کا کوئی ماجرا مولوی صاحب پر گزرا تھا تو اس قصے کے ساتھ اپنا قصہ بھی ضرور بیان کر دیتے۔ غرض ایک شعر کی تصریح میں آدھ آدھ گھنٹہ گذر جاتا۔ مگر اس کے بعد جو وہ شعر ذہن نشین ہوتا تو اس کا محو ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ اب تک مجھے اکثر شعر یاد ہیں۔ اگر کوئی رزمیہ قصیدہ ہوا تو اس سلسلے میں اکثر غدر کے حالات بیان کرتے اور جو کچھ شرفائے دہلی پر اس طوفان بے تمیزی میں گزری تھی اسکی

داستان نہایت دردناک الفاظ میں سناتے۔ اکثر کہا کرتے تھے "میاں بچارا بہادر شاہ مجبور تھا۔ کسی اور پر بھی اگر یہی مصیبت نازل ہوتی تو وہ بھی اسی طرح ان بدمعاش تلنگوں کے ہاتھ میں ناچتا۔ یہ لوگ کوئی بادشاہ کو فائدہ پہنچانے تھوڑی آئے تھے ان کی غرض تو شہر لوٹنا تھی۔ وہ پوری ہوئی اور انہوں نے دہلی کو گھک کر دیا۔ ایک روز میں دریبہ میں سے جا رہا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی آ رہی ہے۔ میں بھی ڈبک کر گلاب گندھی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے، مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے مگر ان کی عجیب کیفیت تھی، گھوڑے کیا تھے دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے۔ بیچ میں سوار تھے مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھریاں کیا تھیں، دہلی کی لوٹ، جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اس کے کپڑے تک اتروا لئے، جس روپے پیسے والے کو دیکھا اس کے گھر پر جا کر ڈھئی دیدی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعہ کو تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جب تک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔ غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا دین دین کے نعرے مارتا میرے سامنے سے گزرا۔ اس جم غفیر کے بیچوں بیچ دولھا میاں تھے۔ یہ کون تھے عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولہ معلوم ہوتے تھے۔ جڑاؤ زیور میں

لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کونسا مردانہ زیور ہے۔ اور کونسا زنانہ۔ صافے پر بجائے طرّے کے سراسری لگا لی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے۔ اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان کے ہی ہاتھ آ گئی ہے گلاب گندھی نے جوان لیڈروں کو آتے دیکھا چپکے سے دوکان بند کر دی۔ اور اندر دروازوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اس کی دوکان کے سامنے آکر رکا۔ بہادر خاں نے ادھر ادھر گردن پھیری، پوچھا "یہ کس کی دوکان ہے" ان کے ایڈیکانگ نے عرض کی کہ گلاب گندھی کی۔ فرمایا "اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ ما بدولت ادھر سے گذر رہے ہیں۔ دوکان بند کرنے کے کیا معنی ابھی کھلواؤ" خبر نہیں کہ اس حکم قضا شیم کا بجائے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ دروازہ کھولو اور جس طرح سم سم کھل جا" کے الفاظ سے علی بابا کے قصے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا۔ اسی طرح اس حکم محکم سے گلاب گندھی کی دوکان کھل گئی۔ بجنسہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشہ کا پردہ اٹھ گیا دروازہ کے بیچوں بیچ لالہ جی کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے شاید کسی موٹی آسامی کو مار کر آئے تھے، کہنے لگے "تمہاری ہی

دوکان سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے" لالہ جی نے بڑی زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے، اور دو کنتر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کئے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے تولہ کا۔ بہادر خاں نے دونوں کنتر لئے کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا۔ ایک کی گردن دوسرے سے ٹکرادی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ عطر سونگھا کچھ پسند آیا" ایک کنتر گھوڑے کی ایال پر الٹ دیا۔ اور دوسرا دم پر۔ کنتر پھینک حکم دیا گیا" "فارورڈ" اور اس طرح بچارے گلاب گندھی کا سینکڑوں روپے کا نقصان کرکے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیئے۔ ادھر اس خدائی فوجدار کا جانا" ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا بچارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دوکان بند کر دی۔ بھئی غدر کے طوفان۔ بے تمیزی میں نقصان تو جو ہونا تھا وہ ہوا مگر کالج کی دوربین توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے ملک کو پہنچایا۔ اس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کی نذر کی تھی۔ اس کا سامنے کا شیشہ بڑی دقت سے تیار ہوا تھا۔ اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ غرض کہ یہ دوربین کالج کا سرمایہ ناز تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے۔ غدر کے زمانہ میں

کسی بدمعاش کی اس پر بھی نظر پڑ گئی۔ اس نے جا کر فوج میں اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازہ سے آکر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے۔ اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے۔ یہ سننا تھا کہ فوج کالج پر چڑھ آئی، سیڑھیاں لگا، سینکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔ ایک کندۂ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشے پر مارا، جھن سے شیشہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی۔ ان نابکاروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، دوربین کی دوربین اٹھا نیچے پھینک دی۔ اور چند ہی منٹ کے اندر دین دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا ان ناخلفوں کے ہاتھوں خاتمہ بالخیر ہو گیا۔"

غدر کے ہزاروں واقعات مولوی صاحب سے سنے ہیں۔ لیکن اکثر تو ایسے ہیں کہ ان کا زمانۂ موجودہ میں دہرانا خطرناک ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پوری طرح یاد نہیں رہے۔ ہم بی اے میں پڑھتے تھے کہ کیمبرج سے غدر کے متعلق ایک جواب مضمون پر انعام مقرر ہوا۔ اس مضمون کے لئے شرط یہ قائم کی گئی تھی کہ کوئی واقعہ تاریخی کتاب سے نہ لیا جائے، جو کچھ لکھا جائے شہر کے بڈھے بڑھیوں سے دریافت کر کے لکھا جائے۔ میں نے یہی مضمون لکھا تھا۔ اور مجھ ہی کو یہ انعام ملا۔ اس مضمون میں میں نے ایک باب مولوی صاحب کے بیان کردہ قصوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ میں کرید کرید کر مولوی صاحب سے اس مضمون کے لئے واقعات دریافت کیا کرتا اور وہ خوشی خوشی بتاتے۔ اب وہ مضمون دریا برد نہیں تو دریا پار ضرور ہو گیا۔

مسودہ نہ رکھا اور نہ رکھنے کی عادت ہے، اس لئے اب اس کا ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

ہمارے پڑھنے کا طریقہ تو سن چکے، اب مولویوں کی جماعت کا حال سن لیجئے۔ اس جماعت میں تمام کے تمام سرحد پار ہی کے لوگ تھے۔ لمبے لمبے کرتے، بڑی بڑی آستینیں، ڈیڑہ ڈیڑھ دو دو تھان کی شلواریں، شملہ بہ مقدار علم کے لحاظ سے کئی کئی سیر کے پگڑ، لمبی لمبی داڑھیاں، غرض معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کا کوئی قطعہ اٹھا کر تباشوں کی گلی میں رکھ دیا گیا ہے۔ محنت کی یہ حالت کہ رات رات بھر کتاب دیکھتے۔ ٹھوٹھ ایسے کہ باوجود اس محنت کے کورے کے کورے رہتے۔ مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ ان کی موٹی عقل کی تعریف کیا کرتے اور کہتے "بھئی میں ان ملانوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہیں۔ اور میرا بھی۔ جواب اس لئے نہیں دے دیتا کہ دلشکنی ہوگی۔ مگر کیا کروں اللہ میاں نے ان لوگوں کو ادب سمجھنے کا دماغ ہی نہیں دیا ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بھلا ان کو حماسہ یا متنبی پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ فوج میں نوکر ہو جائیں، محنت مزدوری کریں یا ہینگ کا توبڑا گلے میں ڈال کر بیچتے پھریں"۔ ہم کہتے "مولوی صاحب آپ بھی غضب کرتے ہیں رگڑ سے پتھر بھی گھس جاتا ہے۔ آخر متنبی نے ایسے کون سے شعر کہے ہیں جو غور کرنے سے سمجھ میں نہ آئیں۔ ایک روز فرمانے لگے دو لو آج تم ٹھیر جاؤ اور ان مولویوں کا رنگ بھی دیکھ لو، مگر دیکھو کہیں ہنس نہ دینا، ورنہ چھرا ہی بھونک دیں گے۔ اس روز ہم کو بھی چھٹی تھی۔

ہم پڑھکر فارغ ہوئے تھے کہ یہ جماعت آگئی۔ یہ لوگ مولوی صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ اور ہم اٹھ کر ایک کونہ میں جا بیٹھے اس روز مقامات حریری کا سبق تھا۔ کتابیں کھولی گئیں۔ اور ایک صاحب نے بڑی گرجتی ہوئی آواز میں اعوذ باللہ سے سبق شروع کیا۔ زید بن حارث کے سفر کا حال تھا اور رات کے وقت سفر کرنے کو "فی اناء اللیل" سے ادا کیا تھا۔ ان بھلے آدمیوں نے رات کو قاموس دیکھکر مطالعہ کیا تھا۔ اس میں شامت اعمال سے "اناء" کے معنی "مٹکے" کے بھی ہیں اللہ دے اور بندہ لے۔ انہوں نے یہاں مٹکا پھنسا دیا۔ اور نہایت متانت سے "فی اناء اللیل" کے معنی "رات کے مٹکے میں سفر کیا" سے کردیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا "اناء کے دوسرے معنی بھی تو ہیں" پڑھنے والے صاحب نے کہا "جی ہاں کئی معنی ہیں لیکن اس مقام پر مٹکا ہی زیادہ چسپاں ہوتا ہے"۔ ہم کو ہنسی آئی۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر اور ان لوگوں نے نہایت بڑے بڑے دیدوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سوچا بھائی یہاں ہمارا ٹھکانا نہیں یہاں سے کھسک ہی جانا مناسب ہے۔ کہیں کوئی اٹھ کر گلا نہ گھونٹ دے۔ ہم نے اجازت چاہی۔ مولوی صاحب کہتے ہی رہے "بیٹھو ذرا اور کچھ سن جاؤ"۔ ہم نے کہا "مولوی صاحب ہم کو کام ہے کسی اور دن دیکھا جائے گا" یہ کہہ جوتیاں پہن سر پر پاؤں رکھکر بھاگے۔ کوٹھے سے اتر جو ہنسنا شروع کیا تو گھر پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ہنسی رکی اب جب کبھی خیال آتا ہے تو اس جماعت کا نقشہ آنکھوں کے نیچے پھر جاتا ہے۔ اور رات کے مٹکے میں سفر کرنے کا فقرہ

ہنساتا نہیں تو مسکراہٹ ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

مولوی صاحب کو اپنے ترجمہ پر ناز تھا۔ اور اکثر اس کا ذکر فخریہ لہجہ میں کیا کرتے تھے۔ اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچائی ہے وہ ان کے نزدیک بہت معمولی چیز تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ اس میں مجھے جتنی محنت اٹھانی پڑی ہے اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ ایک ایک لفظ کے ترجمہ میں میرا سارا سارا دن صرف ہو گیا ہے۔ "میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے"۔ ہم نے کہا "مولوی صاحب بٹھایا نہیں ٹھونسا ہے۔" جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب اُچھل پڑے بڑے خفا ہوتے اور کہتے "کل کے لونڈو! میرے محاوروں کو غلط بتاتے ہو۔ میاں میری اردو کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے، خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے"۔ محاوروں کی بھرمار کے متعلق اکثر مجھ سے ان کا جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ کہا کرتا تھا "مولوی صاحب آپ نے محاوروں کی کوئی فہرست تیار کر لی ہے۔ اور کسی نہ کسی محاورہ کو آپ کسی نہ کسی جگہ پھنسا دینا چاہتے ہیں۔ خواہ اس کی گنجائش وہاں ہو یا نہ ہو۔ جناب والا اہل زبان کو یہ دکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ محاوروں پر حاوی ہے یہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو بتانا چاہتے ہیں، کہ ہم باہر والے نہیں دہلی والے ہیں"۔ تھوڑی دیر تو حجت کرتے رہے اس کے بعد کہتے "اچھا بھئی تم ہی دہلی والے سہی۔ ہم تو اسی طرح لکھیں گے جس طرح اب تک لکھا ہے۔ تم ہم کو دہلی والوں کی فہرست سے نکال دو مگر میاں اپنا ہی

نقصان کروگے۔"

مجھکو مولوی صاحب کی طرز تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو میرے لئے ابتدا ہی میں "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آگئی ہے۔ لیکن باوجود ان موانعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے یہی کہا۔ اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے۔ اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انہوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان اور قلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔ ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستے میں عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ یہ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں ہوں، مولوی بھی ہوں۔ بہرحال ان کی تحریر کا ایک خاص رنگ ہے اور اس کی نقل اتارنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ ترجمہ کرنے کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کئی زبانوں پر حاوی تھے۔ اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیا۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ۱۹۰۳ء کے دربار

تاج پوشی پر جو انگریزی کتاب لکھی گئی تھی اس کا ترجمہ مولوی صاحب
کے سپرد ہوا۔ ایک روز جو ہم پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوبصورت سی
جلد کی ایک موٹی کتاب مولوی صاحب کی میز پر رکھی ہے۔ ہم نے اجازت
لیکر کتاب اٹھائی اور اول سے آخر تک ساری تصویریں دیکھ ڈالیں
اول تو مولوی صاحب بیٹھے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے "بیٹا یوں سرسری
نظر سے کیا دیکھتے ہو، گھر لیجاؤ، اچھی طرح پڑھو مگر دیکھو خراب نہ کرنا۔"
ہم دونوں نے دل میں سوچا کہ خدا معلوم یہ کیا بھید ہے جو مولوی صاحب
بغیر مانگے اپنی کتاب دے رہے ہیں۔ خوش خوش کتاب بغل میں مار
گھر آئے۔ دو ایک روز میں پڑھ ڈالا۔ ایک آدھ تصویر بھی غائب کر دی
چوتھے روز کتاب لیجا مولوی صاحب کے حوالہ کی۔ پوچھا "کہو پسند آئی؟"
ہم نے کہا "مولوی صاحب خوب کتاب ہے!" کہنے لگے "اچھی کتاب
ہے تو ترجمہ کر ڈالو"۔ ہم نے کورا جواب دیدیا۔ کہا "دیکھو، سنو، اس کتاب
کا مجھے ترجمہ کرنا ہے۔ تم سے ترجمہ کراؤں گا۔ صحیح میں کر دوں گا۔
اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اتنی بڑی کتاب کا ترجمہ کر سکوں۔ اگر
اب کے انکار کیا تو کل سے گھر میں گھسنے نہ دوں گا۔ یہ کہتے کہتے
کتاب کی جلد توڑ دس صفحے میرے اور دس میاں دانی کے حوالہ
کر دیئے۔ ساتھ ہی میاں رحیم بخش کو آواز دی وہ آئے ان کو حکم
دیا کہ ایک ایک دستہ بادامی کاغذ کا ان دونوں کو دیدو۔ وہ قہر
درویش برجان درویش کی صورت تھی۔ جس طرح پہلے خوشی
خوشی پوری کتاب لے گئے تھے اسی طرح منہ بنائے ہوئے ان
پلندوں کو بغل میں مارا۔ گھر آکر بیگار کے کام کی طرح ترجمہ کیا دوسرے

روز جا کر پڑھنے کے لئے کتاب اٹھائی۔ پوچھا "ترجمہ لائے" ہم نے دبی ہوئی آواز میں کہا "لائے" کہا "پہلے وہ پڑھو" ہم پڑھتے جاتے اور مولوی صاحب اصل کتاب دیکھکر اس کی درستی کرتے جاتے اب اگر میں یا میاں دانی کہیں کہ یہ ترجمہ ہمارا ہے تو یقین مانئے کہ دونوں جھوٹے ہیں۔ مولوی صاحب کی اصلاح نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس علم میں بھی مولوی صاحب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سے ہمیں ترجمہ کا شوق ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں کتاب ختم ہو گئی۔ اس کے چھپنے کے بعد ہماری مولوی صاحب سے بڑی جنگ ہوئی۔ کیونکہ بندۂ خدا نے ہم دونوں غریبوں کا اس میں ذرا بھی ذکر نہیں کیا۔ مگر کچھ پرواہ نہیں۔ اس کا بدلہ ہم اب لے لیتے ہیں۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس کتاب میں تھوڑے بہت لفظ ہم دونوں کے بھی ہیں یہ ضرور ہے کہ اگر اصلاح شدہ مسودوں کو دیکھا جائے تو کاٹ چھانٹ کی وجہ سے ہمارے لفظوں کا تلاش کرنا سر میں لیکھیں دیکھنے سے کم مشکل نہ ہوگا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولوی صاحب چونکہ کئی زبانوں پر حاوی تھے۔ اس لئے ان کو کہیں نہ کہیں سے مناسب لفظ ادائے مطلب کے لئے ضرور مل جاتا تھا۔ مثلاً اسی جشن تاج پوشی کی کتاب میں ایک جگہ لفظ STALLION آیا۔ ڈکشنری میں جو دیکھا تو اس کے معنی "سیاہ بڑا جنگی گھوڑا" نکلے یاروں نے ترجمہ میں وہی الفاظ ٹھونک دیئے۔ جب مولوی صاحب نے یہ الفاظ سنے تو بہت ہنسے۔ کہنے لگے "واہ بیٹا، واہ کیوں نہ ہو،

دہلی والے ہو خالص اردو لکھی ہے۔ بندۂ خدا "شبدیز" لکھ دو۔ چلو
چھٹی ہوئی۔ اب کوئی صاحب اس سے بہتر لفظ بتا دیں تو میں جانوں
ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے، لیکن
وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ
اٹھا کر دیکھو وہی لفظ بر لفظ ہے۔ معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی
جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ سینکڑوں کتابوں کے ترجمہ ہوئے، دوسری
اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے۔ لیکن تعزیرات ہند
کا ترجمہ جوں کا توں ہے۔ ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں ہوا۔ کہا کرتے
تھے کہ "تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے
ترجمے کا کام تین آدمیوں کے سپرد ہوا تھا ان میں ایک مولوی عظمت اللہ
صاحب تھے۔ اس کی اصلاح ڈائرکٹر صاحب کے ذمہ تھی اور ہم ڈائرکٹر
صاحب کو سناتے۔ وہ بڑا غل مچاتے کہ یہ لفظ خلاف محاورہ ہے۔
اس لفظ سے مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہ لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا ہے
غرض دو تین دفعات کہیں تین چار گھنٹے میں پاس ہوتیں۔ مجھے بڑا
تاؤ آتا تھا کہ ترجمہ کرے کوئی، یہ باتیں سنے کوئی۔ مگر بھئی یہ
ضرور کہوں گا کہ وہ بھلا آدمی جو بات کہتا تھا باون تولے پاؤ رتی کی
کہتا تھا۔ جو اعتراض کرتا تھا وہ اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ میاں پرانے
زمانے کے انگریز غضب کی اردو سمجھتے تھے۔ گو اچھی اردو لکھ نہ
سکیں، مگر ترجمہ کی وہ وہ غلطیاں نکالتے تھے کہ تم جیسے دہلی
والوں کے کان پکڑوا دیں۔ میں بھی ترجمہ دیکھتا تو واقعی کچھ اکھڑا
اکھڑا معلوم ہوتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر

میدان میں کیوں نہیں آجاتا۔ اُردو جانتا ہے، فارسی جانتا ہی عربی
جانتا ہے کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا
نہیں تو کم سے کم ایسا ترجمہ تو بھی کرلے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل
ڈکشنری بازار سے خرید لایا۔ رات کو لیمپ جلا، کپڑے اتار، لنگوٹ
باندھ، ترجمہ پر پل پڑا۔ جن دفعات کا ترجمہ دوسرے روز پیش ہونے
والا تھا ان کا خود ترجمہ کرڈالا۔ دوسرے روز ترجمہ جیب میں ڈال
دفتر پہنچا۔ ڈائرکٹر صاحب آئے مجھے بلایا اور ان لوگوں کے
ترجمے کو سن کر وہی گڑبڑ شروع کی۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان
ہوئی۔ میں نے کہا کہ کمترین بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ کہا، اچھا کہو
میں نے جیب میں سے کاغذ نکالا، وہ سمجھے عرضی ہے۔ لینے کو ہاتھ
بڑھایا میں نے کہا عرضی نہیں، آج کی دفعات کا ترجمہ میں نے کیا
ہے۔ ڈائرکٹر صاحب یہ سنکر اُچھل پڑے۔ کہنے لگے تم نے، تم نے
ترجمہ کیا ہے۔ تم کو تو انگریزی نہیں آتی پھر ترجمہ کیسے کیا۔ میں نے
کہا رائل ڈکشنری سے۔ انہوں نے ہنس کر کہا تعزیرات ہند کا ترجمہ
رائل ڈکشنری سے نہیں ہوا کرتا۔ میں نے کہا سن تو لیجئے۔ کہا اچھا
سُناؤ۔ میں نے جو پڑھا تو صاحب بہادر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ
گئیں۔ کہنے لگے یہ ترجمہ تم نے رائل ڈکشنری سے کیا ہے! میں نے
کہا، ہاں، کہنے لگے کل شروع کی چار دفعات کا ترجمہ کرکے لاؤ۔ میں
دوسرے دن لیکر گیا، بہت پسند کیا اور کہا تم نے پہلے ہی کیوں نہ
کہا کہ میں ترجمہ کرسکتا ہوں جو میرا اتنا وقت ضائع کرایا۔ جاؤ تم بھی
ان ترجمہ کرنے والوں میں شریک ہوجاؤ۔ اس دن سے ہم بھی

پانچوں سواروں میں مل گئے اور یہی ہماری ترقی کا زینہ تھا۔ اب رہے ہماری تصنیفات پر انعام، وہ تو اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کہتا بھی کہ مراۃ العروس پر تم کو انعام ملے گا تو میں اس کو دیوانہ سمجھتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنی لڑکی کے لئے لکھی تھی، وہی پڑھا کرتی تھی۔ میاں بشیر کو "چند پند" لکھدی تھی۔ میں اس زمانے میں تعلیمات کا انسپکٹر تھا، دورے پر نکلے تھے۔ بال بچے ساتھ تھے ایک جگہ ٹھیرے تھے کہ مسٹر کیمپ سن ڈائرکٹر تعلیمات کا ڈیرہ بھی قریب میں آلگا۔ شام کا وقت تھا۔ میاں بشیر اپنی ٹٹوانی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلے۔ ادھر سے ڈائرکٹر صاحب آ رہے تھے۔ میاں بشیر نے جھک کر سلام کیا۔ صاحب ٹھیر گئے پوچھا میاں تمہارا کیا نام ہے"؟ انہوں نے نام بتایا۔ پھر پوچھا "تمہارے والد کون ہے"؟ انہوں نے میرا نام بتایا۔ پھر پوچھا "کہو میاں کیا پڑھتے ہو" انہوں نے کہا "چند پند" ڈائرکٹر صاحب سمجھے تھے کہ اردو کی پہلی یا دوسری کہے گا۔ چند پند کا نام سنکر پریشان ہوئے۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نام سے ان کے کان نا آشنا تھے۔ کہا "ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے"؟ بشیر نے کہا "جی ہاں ابھی لاتا ہوں۔ ہماری آپا کی بھی کتاب دیکھئے گا۔" انہوں نے کہا اس کتاب کا کیا نام ہے؟" انہوں نے کہا مراۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا۔ صاحب نے کہا "ہاں وہ بھی لاؤ۔ میاں بشیر ٹٹوانی سے کود بھاگتے ہوئے ڈیرے میں آئے۔ اپنا جزدان کھول "چند پند

نکالی۔ اس کے بعد اپنی بہن کے جزدان پر قبضہ کیا۔ اس نے جو دیکھا کہ بشیر جزدان ٹٹول رہا ہے تو دوڑتی ہوئی گئی۔ اتنے میں بشیر مراۃ العروس لے کر بھاگا، یہ اس کے پیچھے بھاگی، دونوں میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی۔ خوب رونا پیٹنا ہوا۔ بشیر بہن کو دھکا دے کتاب لے یہ جا وہ جا۔ بہن صاحبہ نے دل کا بخار آنسو بہا کر نکالا۔ میاں بشیر نے دونوں کتابیں لے جا، صاحب کے حوالہ کیں۔ انھوں نے الٹ پلٹ کر کچھ پڑھا اور بشیر سے کہا "ہم یہ کتابیں لے جائیں، کل بھجوا دیں گے۔" انہوں نے کہا "لیجائیے کل ہم کو چھٹی رہے گی۔" میں جو ڈیرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قیامت مچ رہی ہے۔ لڑکی نے رو رو کر آنکھیں لال کر لی ہیں۔ میاں بشیر ڈرے سہمے ڈیرے کے ایک کونے میں دبکے بیٹھے ہیں۔ میرا اندر قدم رکھنا تھا کہ فریاد کی صدا بلند ہوئی۔ صاحبزادی نے رو رو کر اس طرح واقعہ بیان کیا جس طرح کسی عزیز کے مرنے کا کوئی بین کرتا ہے۔ میں نے بشیر کو بلایا وہ ڈرے کہ کہیں ٹھکائی نہ ہو جائے پہلے ہی سے بسورنا شروع کیا۔ وہ دبے جاتے تھے اور بہن شیر ہوئی جاتی تھی آخر بڑی مشکل سے یہ معلوم ہوا کہ ایک انگریز دونوں کتابیں لے کر چلا گیا۔ میں نے جا کر سائیس سے پوچھا کہ وہ انگریز کون تھا۔ تو معلوم ہوا کہ سامنے جو ڈیرے پڑے ہیں ان میں وہ اترے ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ بھلا ڈائرکٹر صاحب کو بچوں کی کتابوں سے کیا کام۔ خیر لڑکی کو دلاسا دیا کہ میں لا دونگا، نہیں تو دوسری لکھ دوں گا۔ اس نے کہا کہ میں لوں گی تو وہی کتاب

لوں گی۔ بڑی مشکل ہے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اب فکر ہوا کہ صاحب سے پوچھوں تو کیونکر پوچھوں۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ صاحب کا مطلب اس طرح بچوں کی کتابیں منگوانے سے کیا ہو سکتا ہے۔ غرض اسی شش و پنج میں صبح ہو گئی۔ کوئی سات بجے ہوں گے کہ صاحب کا چپراسی آیا اور کہا کہ صاحب سلام بولتے ہیں وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاحب بیٹھے مراۃ العروس پڑھ رہے ہیں، سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ صاحب نے کہا "مولوی صاحب آپ نے ایسی مفید اور دلچسپ کتابیں لکھیں اور طبع نہ کرائیں۔ اگر کل آپ کا لڑکا مجھ کو نہ ملتا تو شاید کوئی کبھی ان کتابوں کو نہ دیکھتا اور چند ہی روز میں بچوں کے ہاتھوں یہ کتابیں پھٹ پھٹا کر برابر ہو جاتیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں مراۃ العروس کو سرکار میں پیش کر دوں۔ آج کل گورنمنٹ ایسی کتابوں کی تلاش میں ہے۔ جو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں داخل ہو سکیں"۔ میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے" یہ کہکر میں چلا آیا۔ صاحب نے وہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ وہاں سے انعام ملا۔ یہاں شیر کے منہ کو خون لگ گیا اوپر تلے کئی کتابیں گھسیٹ ڈالیں۔ جو کتاب لکھی اس پر انعام جو لکھا گیا پسند کیا گیا۔ غرض ہم مصنف بھی بن گئے اور ساتھ ہی ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گئے۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ انسان کا جتنا عہدہ بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اس کی فرصت کا وقت بھی گھٹتا جاتا ہے۔ یہی مصیبت ہم پر پڑی۔ ادھر کام کی زیادتی ادھر سرسید کی فرمائشوں کی بھرمار۔ آج یہاں لکچر دیا، کل وہاں دیا۔ تصنیف کا سلسلہ

ہی ٹوٹ گیا۔ خدا خدا کر کے بڑھاپے میں فرصت ملی تو قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ شوق ہوا کہ اس کا ترجمہ بھی کر لو۔ لوگوں کو بھی مفید ہوگا اور ممکن ہے کہ تمہاری نجات کا بھی ذریعہ ہو جائے۔ غرض جتنی محنت ممکن تھی۔ اتنی محنت کی۔ اسی ترجمے کے سلسلے میں "الحقوق والفرائض" کا مواد بھی جمع کر لیا۔ کلام مجید کی دعاؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کر لیا۔ غرض ایک بنتھ اور کئی کاج ہو گئے۔ مگر بھئی سچ کہنا کہ کیسا ترجمہ کیا ہے"! میں تو خاموش رہا مگر دانی نے کہا کہ مولوی صاحب ہم کو اس ترجمے کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولوی صاحب نے کہا "ہیں میاں دانی! یہ کیا کہا، تم نے ابھی تک میرا ترجمہ نہیں دیکھا، بھئی غضب کیا۔ ارے میاں رحیم بخش ذرا ادھر تو آنا، وہ جو سنہری جلد کی حمائل شریف ہے وہ میاں دانی کو دے دو۔ بیٹا ذرا اس کو غور سے پڑھو۔ دیکھو تو میں نے اس بڑھاپے میں کیا محنت کی ہے۔" غرض حمائل شریف میاں دانی کے قبضے میں آگئی۔ انہوں نے شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ یہ آپ کی یادگار رہے گی۔ جب ہم اٹھ کر چلنے لگے تو مولوی صاحب نے دانی سے کہا۔ ارے بھئی ایک بات تو کہنی بھول گیا اس حمائل شریف کا ہدیہ ساڑھے پانچ روپئے ہے کل ضرور لیتے آنا۔ بیچارے کا شکریہ اکارت گیا اور دوسرے روز پورے ساڑھے پانچ روپئے مولوی صاحب نے دھروا لئے۔

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کئے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے

انھیں کبھی ایک پیسہ نہ دیا۔ یہ نہیں کہ خدا نخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا۔ میں اس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ "اچھا بھئی تو یوں ہی لے جا، مگر میرا پیچھا چھوڑ" میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پر قبضہ کرتا۔ مولوی صاحب قیمت مانگتے، میں حجت کرتا۔ وہ جواب دیتے میں اس کا جواب دیتا، غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا۔ مگر خدا غریق رحمت کرے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب مجھے دے دیتے تھے اور جان جان کر جھگڑتے تھے۔ ریویو کے لئے جو کتابیں آئیں وہ تو ہمارے باپ دادا کا مال تھیں وہ پورا ریویو لکھنے بھی نہ پاتے کہ کتاب کے صفحہ اول پر میرا نام درج ہو کر شہادت دستاویزی اور ثبوت قبضہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ اس وقت بھی میرے پاس اس زمانے کی بعض کتابیں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ میاں دانی کو جو حمائل شریف عطا ہوئی تھی وہ ان کے پاس رہی یا نہیں۔

کتابیں تو کتابیں میں نے مولوی صاحب کی ایل۔ ایل۔ ڈی کی گون پر قبضہ کرنے کی فکر کیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب میں اور دانی بی۔ اے میں پاس ہوئے تو جلسہ تقسیم اسناد کے لئے لاہور جانا پڑا۔ گون بنوانا بے ضرورت سمجھا گیا۔ اب خیال ہوا کہ گون کس کی چھینیں دانی کو تو گون مل گئی۔ میں نے مولوی صاحب کی گون تاکی۔ ہم دونوں ملکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "بیٹا! میری گون بڑی قیمتی ہے ساڑھے چھ سو

روپئے میں دو گونیں پڑی ہیں۔ بھلا میں کیا خریدتا، یہ میاں مشرف نے میرے سر منڈھ دیں۔ وہ ایڈنبرا میں پڑھتے تھے، مجھے لکھا کہ اپنی تمام تصنیفات و تالیفات کی نہایت عمدہ جلدیں بندھواکر بھجوا دیجئے، سر ولیم میور دیکھنا چاہتے ہیں۔ سر ولیم میور پہلے ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر تھے، مجھ پر بھی بہت مہربان تھے۔ میں نے مشرف کے لکھے کو سچ جانا، کتابوں کی جلدیں بندھواکر ایڈنبرا روانہ کر دیں ان کتابوں میں میرا کلام مجید کا ترجمہ بھی تھا وہ بہت پسند کیا گیا۔ سر ولیم میور نے یہ کتابیں ایڈنبرا یونیورسٹی میں پیش کر دیں اور ہمیں گھر بیٹھے ایل ایل ڈی کی ڈگری مل گئی، مگر اس ڈگری کی اطلاع میرے پاس بعد میں آئی۔ پہلے ایک درزی کا خط اور بل آیا کہ مسٹر مشرف کی فرمائش کے بموجب ایل ایل ڈی کی ایک سیاہ اور ایک سرخ گون معہ ٹوپی کے روانہ کی گئی ہے۔ براہ کرم جس قدر جلد ممکن ہو ساڑھے چھ سو روپئے روانہ فرمایئے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے یا تو مشرف دیوانہ ہو گیا ہے یا یہ درزی پاگل ہے کہ بیٹھے بٹھائے بل روانہ کر رہا ہے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گون کا بلندہ بھی آگیا غرض اسی شش و پنج میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسری ڈاک سے ایل ایل ڈی کی ڈگری ملنے کا مراسلہ اور میاں مشرف کا خط ملا۔ قہر درویش برجان درویش، درزی صاحب کو رقم روانہ کی، مشرف کو برا بھلا لکھا کہ وہاں سے یہ تھیلے بنوا کر بھجوانے کیا ضرور تھے، میں یہاں اپنے ناپ کی گون بنوا لیتا۔ بہرحال یہ گونیں ساڑھے چھ سو روپئے

کی ہیں معاف کیجئے میں نہیں دے سکتا۔ جا کسی پروفیسر کی گون چھین کر کیوں نہیں لے جاتا، جو میرے پیچھے پڑا ہے" میں یہ قصہ چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ اس کے بعد بغیر کچھ کہے سنے اٹھا اور مولوی صاحب کے سامان کی کوٹھری کا رخ کیا۔ وہ "ہاں ہاں ہاں ہاں" کہتے ہی رہے، میں نے کنڈے کھول اندر گھس الماری میں سے کالی گون نکال ہی لی۔ جب مولوی صاحب نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا تو سنبھل سنبھلا کر اُٹھے۔ میں اتنی دیر میں دروازہ بند کر گون بغل میں مار پھر اپنی جگہ آگیا مولوی صاحب بھی بیٹھ گئے اور اب انہوں نے گون کی قیمت، میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات بی اے اور ایل ایل ڈی کی گون کے اختلافات غرض اسی طرح بیسیوں چیزوں میں لکچر دے ڈالے میں بیٹھا سنتا رہا۔ جب وہ کہتے کہتے تھک گئے تو میں نے لکچر شروع کیا۔ استادوں کی محبت، اپنی غربت، گون کی صرف ایک روز کی ضرورت، وقت کی قلت، غرض دس بارہ پہلوؤں پر میں نے بھی اسپیچ دیدی اور آخر میں صاف کہدیا کہ یہ گون میں لے کر جاؤں گا۔ اور ضرور لیکر جاؤں گا۔ اس کے بعد مولوی صاحب کچھ نرم پڑے، کہنے لگے، "واپس کب کروگے" میں نے کہا "آپ سرخ گون پہنتے ہیں۔ کالی مجھے دیدیجئے، آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا اور ایک غریب کا فائدہ ہو جائے گا۔" مولوی صاحب نے کہا "نہیں بیٹا! لاہور سے آکر دیدیجو، مجھے دربار وغیرہ میں یہ گون بھی پہننی پڑتی ہے"۔ یہ الفاظ انہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ مجھے بھی وعدہ کرتے ہی بن پڑی۔ آخر میں گون لیکر گیا۔ اور لاہور سے آکر واپس کردی۔ جب مولوی صاحب نے

گون پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت بہت خفا ہوئے، کہنے لگے "اب کے تو اگر کوٹھری میں گھسا تو اچھا ہی نہ ہوگا کل کو میرا کیش بکس اٹھا کر لے جائے گا۔ خیر دانی گون لیجاتا تو کچھ ہرج نہ تھا، کیوں کہ واپسی کی تو امید رہتی۔ مجھے کب امید تھی کہ آپ بزرگ واپس بھی کریں گے۔ وہ تو کہو میرا حلال کا مال تھا جو واپس آگیا" میں نے کہا "مولوی صاحب اگر مجھے پہلے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ کو گون کی واپسی کی توقع نہیں ہے تو آپ اس کی تمام عمر شکل بھی نہ دیکھتے"۔ ہنس کر کہنے لگے "چلو مشتے بعد از جنگ کی صورت ہے۔ آئندہ میں دینے میں احتیاط کروں گا اور تم واپسی میں احتیاط کرنا"۔ اس وقت تو یہ باتیں ہنسی میں ہوئیں مگر اب افسوس ہوتا ہے۔ گون اگر میرے پاس رہ جاتی تو مولوی صاحب کی یادگار ہوتی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ وہ گون میرے پاس بھجدے۔ کیونکہ اس میں میرا بھی حق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ گون مولوی صاحب نے مجھ کو دی تو نہ تھی، لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ یہ ہاتھ سے گئی۔ میری غلطی تھی جو اس کو لیجا کر واپس کیا۔ اب اگر مل گئی تو کبھی ایسی غلطی نہ کروں گا۔

جس طرح مسٹر مشرف نے یہ گونیں مولوی صاحب کے گلے منڈھی تھیں اسی طرح نواب محسن الملک نے حیدر آباد میں فرنیچر ان کے سر چیپک دیا تھا۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں نواب محسن الملک کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی تجویز اور سر سید کی تحریک پر مولوی صاحب حیدر آباد آئے۔ پہلے نواب محسن الملک ہی کے ہاں قیام کیا۔ اس کے بعد علیحدہ کوٹھی میں جا رہے۔ ہندوستانی وضع کا سامان تخت چوکیاں وغیرہ خرید لیں۔ بھلا محسن الملک یہ کیونکر دیکھ سکتے

تھے کہ ان کا دوست پرانی وضع کے لوگوں کی طرح زندگی بسر کرے
ایک روز سکندر آباد جا، ایلن اینڈ کمپنی کو کئی ہزار کے فرنیچر کا آرڈر
دیدیا اور کہدیا کہ مولوی صاحب کے ہاں پہنچا دو اور بل بنا کر بھیج دو۔
ایک روز جو مولوی صاحب اٹھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھکڑے پر
چھکڑا فرنیچر کا لدا کوٹھی کے باہر کھڑا ہے۔ بہت چکرائے، لینے سے انکار کیا۔
مگر وہ نواب محسن الملک کا پڑھایا ہوا شیطان تھا۔ وہ کب ماننے والا
تھا۔ آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے اور دن بھر میں مولوی صاحب کا
مکان صاحب بہادر کی کوٹھی ہو گیا۔ مگر یہ بھی نذیر احمد تھے، کچھ ایسی چال
چلے کہ جب ان کا تقرر پنجرد کی صدر تعلقداری پر ہوا۔ تو وہ سب کا سب
سامان بہت ہی تھوڑی کمی پر ایلن ہی کے سر مارا اور پنجرد وہی
اپنے پرانے تخت وغیرہ لے گئے۔ نواب محسن الملک کو کانوں کان
خبر بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ نواب محسن الملک
دورہ پر نکلے، پنجرد قیام کیا، مولوی صاحب خود کہیں دورہ پر گئے
ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے گھر میں کہلا بھیجا کہ میں آیا ہوں۔
میرے قیام کا انتظام کر دو۔ ایک کمرہ جس میں دو تین کرسیاں اور
ایک دو میزیں تھیں کھول دیا گیا یہ وہ ایلن والے فرنیچر کی تلاش
میں تھے۔ سمجھے کہ مولوی صاحب نے اپنے کمرے میں سجا کر رکھا ہوگا۔
اندر کہلا بھجوا دیا کہ میں مولوی صاحب کے کمرے میں ٹھیروں گا۔ پہلے
تو جواب ملا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہو گی۔ مگر جب ادھر سے اصرار ہوا
تو وہ کمرہ بھی کھول دیا گیا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں صفا چٹ
میدان ہے۔ نہ دری ہے نہ چاندنی نہ میز ہے نہ کرسی۔ کمرے کے بیچ

ہیں ایک چھوٹا سا تخت ہے۔ اس پر ایک کمبل پڑا ہوا ہے۔ بازو میں
ایک چوکی پر رحل اور جا نماز رکھی ہے۔ کھونٹی پر کلام مجید لٹک رہا ہے
یہ بہت چکرائے۔ لوگوں سے پوچھا "وہ فرنیچر کہاں گیا"؟ معلوم ہوا کہ
آتے آتے مولوی صاحب اس کے کوڑے کر آئے۔ بچارے ایک رات
ٹھیرے اور صبح ہی کوچ بول دیا۔

کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اور ان کی بنی رہی، بعد
میں اتنی کھنچی کہ ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک
مجھ پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا چاہتے ہیں۔ محسن الملک کو یہ شکایت
تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہو کر میرے اکھاڑنے کی فکر میں
ہیں۔ غرض جب عماد السلطنت بہادر کا زمانہ آیا اور محسن الملک بہادر
کی کمان چڑھی تو مولوی صاحب کو میدان سے ہٹ جانا ہی مناسب
معلوم ہوا۔ دوسرے حیدر آباد میں صحبت کا جو رنگ تھا وہ ایسا نہ تھا
جس میں مولوی صاحب کا رنگ جم سکتا۔ اس زمانے کے جو حالات
مولوی صاحب بیان کیا کرتے تھے ان کا زبان قلم پر نہ آنا ہی
زیادہ مناسب ہے۔

بعد میں دونوں بظاہر ملتے جلتے تھے، لیکن موقع پڑا تو ایک
دوسرے کو پردے ہی پردے میں سنائے بغیر نہ رہتے تھے
ایک واقعہ تو خود میری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ سنہ ۱۹۰۳ء کے
دربار کے موقع پر کانفرنس کا اجلاس دہلی میں اجمیری دروازہ
کے باہر ہوا۔ اس زمانے میں نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے
سکریٹری تھے۔ کانفرنس کے صدر ہز ہائینس سر آغا خاں تھے۔

آدمیوں کی یہ کثرت تھی کہ بیٹھنے کو پنڈال میں جگہ نہ ملتی تھی ہر جلسے میں کئی کئی رئیس آجاتے تھے۔ ایک پورا دن خاص مولوی صاحب کے لکچر کے لئے مقرر ہوا۔ مدت ہوئی تھی کہ مولوی صاحب نے پبلک میں لکچر دینا چھوڑ دیا تھا۔ اس روز جو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب لکچر دیں گے خلقت ٹوٹ پڑی۔ لکچر شروع ہی ہوا تھا کہ لارڈ کچنر نے کہلا بھیجا کہ آج میں بھی آؤں گا۔ نواب محسن الملک نے ایسے باوقعت ذی وجاہت مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کیں۔ مولوی صاحب کے لکچر میں اسی گڑبڑ سے کھنڈت پڑتی تھی۔ پنڈال کے باہر ذرا گڑبڑ ہوئی اور نواب محسن الملک سمجھے کہ لارڈ کچنر آئے۔ اٹھکر باہر گئے اور پھر آبیٹھے۔ اسی طرح وہ کوئی دس پندرہ دفعہ باہر گئے اور اندر آئے۔ مولوی صاحب بہت جزبز ہوتے۔ خفا بھی ہوئے مگر ان کی کون سنتا تھا۔ قصہ مختصر آخر لارڈ کچنر آہی گئے۔ نواب محسن الملک نے سب کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے خود اپنا تعارف کرلیا۔ لارڈ کچنر کہنے لگے۔ مولوی صاحب ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آج آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔" مولوی صاحب نے کہا "لاٹ صاحب مجھے بھی آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی اور سب سے بڑی یہ خوشی ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمہ حل ہوگیا۔" لارڈ کچنر نے کہا کہ وہ کیا معمہ تھا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ "ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تھلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گرجائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرادے گی۔ مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔

جب آپکی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرادیئے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرادے"۔ تمام پنڈال میں سناٹا ہوگیا مگر مولوی صاحب کو جو کہنا تھا کہہ گئے اور اس طرح اپنے دل کا بخار نکال لیا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید وشاید چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں ہی کے دربار کا واقعہ دیکھ لو۔

امیر حبیب اللہ خاں بقرعید کے دن دہلی میں تھے اس روز جمعہ تھا۔ صبح کو بقرعید کی نماز عیدگاہ میں پڑھی اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، شام کو سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا۔ اس دربار میں ۸ یا ۹ دہلی کے ہندو امیر اور اسی قدر مسلمان مشاہیر بلائے گئے ان میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ سر ہنری میک موہن نے ان لوگوں کا تعارف امیر صاحب سے کرایا۔ جب مولوی صاحب کی باری آئی اور ان کی تعریف سر ہنری نے کی تو امیر صاحب نے کہا "آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود ان کی تصانیف بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اور تقریباً سب کا ترجمہ بھی کراچکا ہوں۔ نیز دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہوگیا" اسکے بعد باتوں ہی باتوں میں پوچھا "آپ شعر بھی کہتے ہیں؟" مولوی صاحب نے کہا "جی ہاں کہتا ہوں۔ لیکن آج آپ کی تعریف میں اپنا نہیں دوسروں کا شعر سناؤں گا"۔ یہ کہکر متنبی کا یہ شعر پڑھا:-

عید و عید و عید مجتمعا ۔۔۔ وجہ الحبیب و یوم العید والجمعا

موقعہ کے لحاظ سے یہ شعر ایسا برمحل ہوگیا کہ متنبی کو نصیب بھی نہ ہوا ہوگا۔ واقعات اور خاصکر حبیب کے لفظ نے شعر میں

جان ڈال دی۔ تمام دربار چمک اٹھا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اٹھکر مولوی صاحب کو گلے سے لگا لیا اور اتنے بوسے دیئے کہ مولوی صاحب گھبرا گئے۔ دوسرے روز جو انہوں نے اس واقعہ کا ذکر ہم سے کیا اس کو انہی کے الفاظ میں دھرانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہنے لگے "بھئی میں تو شعر پڑھ کر مصیبت میں پھنس گیا۔ شعر پڑھنا تھا کہ یہ معلوم ہوا کسی شیر نے آکر مجھے دبوچ لیا۔ اس میرے شیر کا کوئی سوا گز چوڑا سینہ ہیں ٹھیرا چھوٹے قد کا آدمی۔ اس نے جو پکڑ کر بھینچا تو ادھر تو ہڈیاں پلپلی ہوگئیں ادھر دم گھٹنے لگا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی ہزار کوشش کرتا ہوں جنبش تک نہیں ہوتی۔ قسم خدا کی اس وقت تک ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے۔ بارے خدا خدا کر کے گرفت ڈھیلی ہوئی تو میں ذرا علیحدہ ہوا۔ ابھی پوری طرح سانس بھی نہ لینے پایا تھا کہ اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال بوسہ پر بوسہ لینا شروع کیا۔ بھلا مجھ بڈھے کو دیکھو اور امیر صاحب کی اس حرکت کو دیکھو۔ کچھ تعریف کا یہ طریقہ افغانستان ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہوگا۔ مجھے تو مارے شرم کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ اللہ کا بندہ ذرا دم لیتا اور سبحان اللہ کہہ کر پھر لپٹ جاتا۔ لپٹتا اور لپٹتے ہی بوسے لینا شروع کرتا۔ بچارے دوسرے بھلے آدمی بیٹھے ہوئے کیا کہتے ہوں گے۔ جب میں نے اس مصیبت سے رہائی پائی تو میری ناک سے پسینہ اس طرح بہہ رہا تھا جس طرح کسی ٹوٹی صراحی میں سے پانی رستا ہے۔ نا بھائی نا ایسے درباروں کو میرا دور ہی

سے سلام ہے۔ کون شعر پڑھکر اپنی ہڈیاں تڑوائے۔" مولوی صاحب کو اپنی ہڈیاں سہلاتے جاتے اور یہ قصہ بیان کرتے جاتے تھے مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے مارے دل کھلا جارہا ہے اور سمجھ رہے ہیں کہ شعر کی داد اس طرح اور اس رنگ میں آج تک نہ کسی شاعر کو ملی ہے اور نہ ملے گی۔

اس تیزیٔ طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی۔ جو کہنا ہوتا تھا وہ کہے بغیر نہ رہتے تھے۔ اس میں کسی لفٹننٹ گورنر پر ہی حملہ کیوں نہ ہو جائے ۱۹۰۴ء میں لارڈ کرزن کا ایک لکچر ہوا۔ اور اس میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہندوستانی یورپ والوں کی طرح سچ بولنے کی عادت نہ ڈالیں گے اس وقت تک ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔ اخباروں میں یہ لکچر پڑھ کر مولوی صاحب کو بہت غصہ آیا۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے چند روز بعد ہمارے کالج میں سالانہ جلسہ ہوا۔ اور لارڈ لیفرائے جو ہندوستان کے لاٹ پادری تھے تشریف لائے۔ شامت اعمال سے انہوں نے بھی اپنے لکچر کا موضوع یہی قرار دیا۔ کالج کی طرف سے لاٹ صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مولوی صاحب تجویز کئے گئے اب کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ جو کچھ دل میں بخار بھرا تھا۔ خوب اچھی طرح نکال لیا۔ کالج والے حیران تھے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ مولوی صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں یا لاٹ صاحب پر اعتراضات۔ مگر انہوں نے جب تک اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نہ نکال لی، خاموش نہیں ہوئے۔ سب سے پہلے انہوں نے

ہندوستان کے مغربی اثر کو نہایت پُر مذاق پہلو سے بیان کیا۔ فرمانے لگے "حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون، ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامہ ہی کو اچھا کہیں گے۔ مگر آج کل کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے، یہ کیوں۔ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہنا وا ہے۔ ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے کہ اس سے ستر ڈھکتا ہے۔ آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے دلدادہ بھائی کوٹ کو پسند کریں گے۔ یہ کیوں اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہنا وا ہے ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے۔ کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے، نرم نرم اور سبک ہوتی ہے۔ ہمارے فیشن کے عاشق تخ بوٹ کا انتخاب کریں گے۔ یہ کیوں۔ اس لئے کہ یہ انگریزوں کا پہنا وا ہے۔ ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ ان کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں۔ اور بھئی ہے بھی یہی بات قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے۔ ان کی ہر چیز ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور ان کا ہر فعل ہمارے لئے چراغ ہدایت۔ اب افعال سے گزر کر اقوال پر نوبت آ گئی ہے۔ پادری کرزن تھوڑے ہی دن ہوئے فرما چکے ہیں کہ ہندوستانی سچ چھوڑو اور انگریزی سچ بولا کرو۔ آج ہمارے پادری لیفرائے بھی ان کے ہمنوا ہوئے ہیں۔ یا تو انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آ گیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار پھینک دیا جائے اور

پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے۔ یا ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ اب تمہارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خدا کے لئے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو۔ یہ بڑے لوگ ہیں، مولوی نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم ہنس کر ٹال گئے۔ لاٹ صاحبوں کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولو گے اور یہ تازہ مال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی، اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو محتاج ہو جاؤ گے۔ کیونکہ دونوں لاٹ صاحبوں نے یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نوکری کا خبط چھوڑو اور تجارت یا صنعت و حرفت اختیار کرو، اسی سے تمہارے ولدّر دور ہوں گے۔

آخر میں مولوی صاحب نے تھوڑا بہت لارڈ لیفرائے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ لاٹ صاحب اردو بہت اچھی جانتے تھے۔ مولوی صاحب کی اس پُر مذاق تقریر پر مسکراتے رہے۔ مگر دل کا خدا ہی مالک تھا۔ کالج کے منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں مگر یہاں "تیر از کمان جستہ" کی صورت تھی، کیا کر سکتے تھے۔ البتہ دل میں انہوں نے ٹھان لی ہو گی کہ آئندہ مولوی صاحب کو شکریہ ادا کرنے کی تکلیف نہ دینا ہی مناسب ہے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد میں حیدر آباد چلا آیا پھر دو دفعہ

دہلی میں مولوی صاحب سے میرا ملنا ہوا۔ پہلی دفعہ جو ملا تو یہ وہ زمانہ تھا کہ امہات الامہ کی وجہ سے مولوی صاحب پر بڑی لے دے ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑا، کہنے لگے "مجھے تو اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے لوگ اس طرح برانگیختہ ہو جائیں۔ تم نے بھی یہ کتاب دیکھی ہو گی۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ اس میں میں نے ایسی کونسی نئی بات لکھی ہے" میں نے خود امہات الامہ نہیں دیکھی تھی۔ مگر میں مولوی صاحب کے طرز تحریر سے واقف تھا اس لئے میں نے یہی کہا کہ "مولوی صاحب آپ کا طرز تحریر مذاق کا پہلو لئے ہوتا ہے۔ وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں مزا دیتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں اور خاصکر مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کو اعتراض ہو گا تو آپ کی طرز تحریر ہی کے متعلق ہو گا" مولوی صاحب نے کہا "میرے کلام مجید کے ترجمہ کے متعلق تو یہ اودھم کیوں نہیں مچا"۔ میں نے کہا "اس پر بھی لوگوں کو اعتراض ہیں۔ مگر اس میں آپ کا معاملہ اللہ میاں سے ہے اور یہاں انسانوں سے۔ مشہور مقولہ ہے کہ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ ہاں بیٹا کہتے تو سچ ہو۔ اس قسم کی تالیفات میرے دائرہ تحریر سے باہر ہیں۔ انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو رفع کر دوں گا۔

جب میں چلنے لگا تو فرمایا "کہو بیٹا! پھر ملو گے۔ ابھی تو تمہارے جانے میں بہت دن ہیں" میں نے کہا "انشاء اللہ ضرور آؤں گا" ہنس کر کہنے لگے انشاء اللہ کہنے کے بعد تم ضرور آئے۔ مسلمانوں کو

جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو ہزاروں قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ یہ کام میں ضرور کروں گا۔ مگر جب کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا تو ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں۔ کہ انشاءاللہ ضرور کروں گا۔ ہم تو اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اس کام کے کرنے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ ہاں اگر خدا نے چاہا اور زبردستی یہ کام کرا دیا تو مجبوراً کر لیں گے" میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کو "انشاءاللہ" کے یہ معنی پہنانے مناسب نہیں ہیں۔ آپ مذاقیہ پہلو مذہبی معلومات میں بھی نہیں چھوڑتے" کہنے لگے "میاں۔ پہلے انشاءاللہ کے معنی دوسرے تھے آج کل کے مسلمان وہی معنی لیتے ہیں۔ جو میں نے بیان کیے۔" خدا کی قدرت دیکھو کہ اسی رات کو عین میرے پلنگ کے نیچے طاعون کا چوہا مرا اور صبح ہی کے میں سے میں ایسا دہلی سے بھاگا کہ حیدرآباد آ کر دم لیا۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا اس میں آ رہے تھے۔ رعشہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا۔ کہنے لگے "ہیں یہ کون صاحب ہیں"۔ میں نے کہا "میں ہوں" پھر پوچھا "آخر 'میں' کون صاحب ہوئے۔ نام کیوں نہیں بتاتے ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا۔ ذرا قریب آؤ"۔ میں نے کہا "واہ مولوی صاحب واہ۔ اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا، دور سے پہچانیئے تو بات ہے"۔ ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے "او ہو، مرزا فرحت صاحب ہیں۔ بھلا اور کون یہ بے تکی

باتیں کرے گا۔ آؤ بیٹا، آؤ۔ اب کے تو کئی برس کے بعد آئے" میں پاس گیا، گلے لگایا، حالات پوچھتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے کہا "ذرا دیکھنا بھئی گھڑی میں کیا بجا ہے۔" میں نے گھڑی دیکھکر کہا کہ "ساڑھے نو میں پانچ منٹ ہیں" کہنے لگے "اوہو دیر ہوگئی۔ ذرا میرا جوتا اور جرابیں تو لے آؤ۔ میں نے لاکر جرابیں پہنائیں۔ جوتہ سوکھ کر لکڑی ہو گیا تھا۔ وہ زبردستی پاؤں میں ٹھونسا۔ جوتہ پہن کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کھونٹی پر سے اتار کر شیروانی اور ٹوپی دی وہ پہن کر کہنے لگے چلو بھئی چلو وقت تنگ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا "مولوی صاحب آخر کہاں جانا ہے" کہنے لگے "بیٹا آج ایک مقدمہ کی پیشی ہے، وہاں جارہا ہوں، ذرا مجھ کو کشمیری دروازہ تک تو لے چل" بہر حال ہاتھ پکڑ کر نیچے اترے باہر دیکھوں تو کوئی سواری نہیں۔ میں نے کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب اس عمر میں تو اس طرح پیدل نہ پھرا کیجئے" خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے، آخر یہ کس دن کے لئے ہے۔ روپیہ اسی لئے ہوتا ہے کہ خرچ کیا جائے، بال بچوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے، کیوں اس بڑھاپے میں آپ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ذرا اپنی حالت کو دیکھئے اور کشمیری دروازہ کو دیکھئے، یہ دو میل جانا اور دو میل آنا، آپ کو مضمحل کر دے گا۔ ذرا ٹھیر جائیے۔ میں گاڑی لے آتا ہوں" یہ بہت بگڑے اور کہنے لگے "تجھ کو میرے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اب چلتا ہے تو چل نہیں میں کسی اور کو بلاتا ہوں۔ ابھی میرے ہاتھ پاؤں نے ایسا جواب نہیں دیا ہے کہ کشمیری دروازہ تک نہ جا سکوں"۔ میں نے

کہا "مولوی صاحب خدا کے لئے اب تو گاڑی رکھ لیجئے۔ اگر آپ خرچ نہیں اٹھاتے تو میں اٹھاؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے "کیوں ہو روپیہ اچھلنے لگا ہے، کیا میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ گاڑی نہ رکھ سکوں۔ بیٹا بات یہ ہے کہ پہلے تو میں نے اس لئے گاڑی گھوڑا نہیں رکھا کہ سائیسوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک تو دانہ گھاس چراتے ہیں، دوسرے گھوڑے کی مالش نہیں کرتے تیسرے گاڑی کا آج یہ توڑا کل وہ توڑا، کون بیٹھے بٹھائے اپنی بھلی چنگی جان کو یہ عذاب لگائے اور دن رات کا فکر مول لے رفتہ رفتہ پیدل پھرنے کی عادت ہو گئی۔ اب آخری عمر میں گاڑی کی ضرورت ہوئی تو گاڑی رکھتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمام عمر تو مولوی صاحب جوتیاں چٹخاتے پھرے، اب بڑھاپے میں گاڑی پر سوار ہو کر پھرتے ہیں۔ نا بھئی نا اب گاڑی رکھنا وضعداری کے خلاف ہے۔" میں نے کہا "تو کمیشن ہی جاری کرا لیا ہوتا۔" کہنے لگے "وہ بھی میری وضعداری کے خلاف ہے۔ ہمیشہ کچہری میں جا کر گواہی دی، اب بڑھاپے میں اس وضعداری کو کیوں توڑوں" بہر حال یہی حجتیں کرتے کرتے کچہری پہنچ گئے۔ ڈپٹی صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور سب سے پہلے انہیں کا مقدمہ لیکر ان کی شہادت قلمبند کی۔ اور یہ جس طرح گئے تھے اسی طرح ہانپتے کانپتے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر آئے۔

حیدر آباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اُس

چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں اندر قدم نہیں رکھتا مگر باہر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھا کرتا ہوں اور رہ رہ کر ذوق کا یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس